آستین کے سانپ
مولانا محمد اسماعیل ریحان
یہ کتاب ہر مسلمان خصوصاً نوجوانوں کو ضرور پڑھنی چاہیئے!

آستین کے سانپوں یعنی امت مسلمہ کو تباہ کرنے والے غداروں کے عبرت ناک حالات

آستین کے سانپ

یہ کتاب ہر مسلمان خصوصاً نوجوانوں کو ضرور پڑھنی چاہیئے!

مولانا محمد اسمٰعیل ریحان

دار المصحف
ہادیہ حلیمہ سنٹر، غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور
042-37380590 0300-4611953

نام کتاب:	آستین کے سانپ
مرتبہ:	مولانا محمد اسمعیل ریحان
کمپوزنگ:	اورنگ زیب
سرورق:	قیصر شریف
ڈیزائننگ:	سعید قاسم
ناشر:	محمد فہیم عالم
طبع اول:	اگست 2019ء
قیمت:	-/350 روپے

دار المصحف

ہادیہ حلیمہ سنٹر، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور 042-37300590 0300-4611953

www.facebook.com/darulmushafpublisher darulmushaf786@gmail.com

عرضِ ناشر

دار المصحف کا مقصد ایسی کتب شائع کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع کی جاتی ہیں اُن کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔

جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔

اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو از راہِ کرم! مطلع فرمادیں۔ ان شاء اللہ آئندہ ایڈیشن میں ازالہ کر دیا جائے گا۔ شکریہ!

فہرست

انتساب!

ملت کے ان سرفروشوں کے نام!

جو آستین کے سانپوں کا پھن کچلنے کے لیے تیار ہیں۔

مولانا محمد اسمٰعیل ریحان

تاثرات

آستین کے سانپ

''آستین کا سانپ'' ایک بہت عام فہم محاورہ ہے جو شاید فارسی سے ہمارے ہاں آیا۔ فارسی میں اسے ''مارِ آستین'' کہتے ہیں۔

یہ بات اکثر قارئین کے لیے یقیناً بے حد دلچسپی کا باعث ہو گی کہ زمانۂ قدیم میں آستین کو جیب کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔

کہتے ہیں کہ اُن دنوں جن لوگوں کو سانپ پالنے کا شوق ہوتا، وہ اپنے پالتو سانپ کو سفر کے دوران میں اپنی جیبی آستین میں رکھتے تھے۔ اب معلوم نہیں، آستین کی پٹاری میں سانپ بے چارا آرام کرتے تھک جاتا تھا یا بور ہو جاتا کہ دودھ پلانے والے اپنے مالک کو ہی ڈسنے کا شوق پورا کر لیتا۔

بس شاید یہیں سے ''آستین کا سانپ'' محاورہ وجود میں آیا، جو ہر اُس شخص کے لیے کہا جانے لگا جو اپنے ہی مربی کو نقصان پہنچا دے۔ یعنی ہر وہ شخص جو بظاہر ''اپنا'' ہو، جسے آپ نے ہمیشہ فائدہ پہنچایا ہو، وہی موقع ملتے ہی آپ کو ڈس جائے، محسن کشی کرے، وہ آستین کا سانپ کہے جانے کا مستحق ہے۔

آستین میں پلتے سانپ سے جو نقصان ہوتا ہے، ظاہر ہے وہ کھلے دشمن سے ہو ہی نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ کھلا دشمن آپ کے سامنے ہوتا ہے، آپ کی ساری توجہ اُس کی طرف ہوتی

ہے، مگر اپنی ہی صفوں میں موجود غدار وہ آستین کا سانپ ہوتے ہیں کہ شدید زک اٹھانے سے پہلے آپ اُن کے خوشنما چہروں پر پڑا نقاب دیکھ ہی نہیں پاتے۔

تاریخِ اسلامی کے صفحات گواہ ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کو جتنا نقصان اِن آستین کے سانپوں نے پہنچایا، سامنے کے کھلے دشمن اس کا عشر عشیر بھی نہیں پہنچا سکے۔ خود آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام کے دور میں مشرکین اور کھلے کفار کی بنسبت منافقین کی ریشہ دوانیوں نے جو نقصان نوزائیدہ مسلم ریاست کو پہنچایا، وہ بیان سے باہر ہے۔

اس کتاب میں محترم مولانا محمد اسماعیل ریحان صاحب نے جو بلاشبہ عصر حاضر میں مؤرخ اسلام کہلائے جانے کے اوّل مصداق ہیں، نے تاریخ اسلامی کے بڑے بڑے چند آستین کے سانپوں کو بہت دلکش اسلوب میں متعارف کروایا ہے۔

امت مسلمہ کی گود میں پلتے یہ اُن بڑے بڑے فتنوں کی سچی کہانیاں ہیں، جن کی فتنہ گری نے چند سو یا ہزار مسلمانوں کو نہیں، بلکہ بلاشبہ لاکھوں مسلمانوں کو قرنوں تک متاثر کیا۔ یہ جب تک زندہ رہے، غیروں کے اشاروں پر مسلمانوں میں پھوٹ ڈالتے رہے۔ مرے تو چاہے اپنی موت مرے یا مجاہدین کے پیروں تلے کچلے گئے، عبرت کا نشان تو گرچہ بنے... مگر مرتے مرتے بھی ایسے فتنے جگا گئے کہ اُن کی زہرناکی بعد کی کئی صدیوں تک مسلمانوں میں انتشار اور باہمی فساد کا ذریعہ بنی رہی۔ بالخصوص سبائیت و خوارجیت کے فتنے تو ایسے زہریلے اور طاقتور نکلے کہ چودہ صدیاں ختم ہونے کو آئیں، اب تک جسدِ امت کی رگوں میں پوری قوت سے دوڑ رہے ہیں اور بدبودار پھوڑوں کی صورت ظاہر ہو رہے ہیں۔

کتاب پڑھیے اور عبرت کی نگاہ سے پڑھیے۔ تاریخِ اسلامی کے بڑے بڑے آستین

کے سانپوں کے متعلق جانیے اور اوّل اپنے دل پر نگاہ کیجیے کہ کہیں خدانخواستہ آپ کے دل میں بھی تو کوئی منافقت کا سنپولیا نہیں پنپ رہا۔ کہیں آپ بھی تو خدا اور اس کے رسول ﷺ کے بے پناہ احسانات بھول کر امت مسلمہ کے خلاف، شعوری یا غیر شعوری طور پر غیروں کے کسی بھی درجے میں آلہ کار تو نہیں بن رہے...؟

اللہ نہ کرے اگر ضمیر کی عدالت کسی سنپولیے کو پکڑ کر آپ کے سامنے لے آئے تو آستین کے سانپوں کا عبرت ناک انجام یاد کرتے ہوئے اِس سنپولیے کی گردن خود اپنے ہاتھوں مروڑنے میں ذرا دیر نہ کیجیے۔

دعا ہے کہ کتاب میں مذکور آستین کے سانپوں کی معنوی اولادوں جو آج پچھلے کسی بھی دور سے زیادہ تیزی سے پھل پھول رہیں اور امت کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا رہیں، اِن سب سانپوں کے چہروں پر پڑا خوشنما نقاب اتر جائے۔ اِن کی خوبصورت رنگ برنگی دھاریوں والی کینچلی اتر کر اصلیت ظاہر ہو جائے اور اُن کے زہریلے دانت جو "آستین" کے اندر سے جسدِ امت میں گڑے ہیں، سب مسلمان دیکھ لیں... تا کہ اُن سے بچنا اور ان کے پھن کچلنا آسان ہو جائے۔ (اللهم آمین!)

اللہ رب العزت مولانا محمد اسماعیل ریحان صاحب کو بہت زیادہ جزائے خیر عطا فرمائے، آمین!

محمد فیصل شہزاد

مدیر: بچوں کا اسلام، خواتین کا اسلام

20/08/2019

پیش لفظ

پرانے زمانے میں لوگوں کے لباس آج کل سے بہت الگ ہوتے تھے۔اس وقت کرتوں میں جیبیں لگانے کا عام رواج نہیں تھا۔جیب تو عام طور پر رقم رکھنے کے لیے بنائی جاتی ہے۔اس زمانے کی رقم آج کل کی طرح کاغذی نہیں تھی۔چاندی کے درہم یا سونے کے دینار یعنی اشرفی کا زمانہ تھا۔کوئی اگر دو سو درہم ساتھ لے کر نکلتا تو سمجھیے اس نے لگ بھگ آدھ کلو سے زیادہ وزن اٹھا رکھا ہوتا تھا۔اتنا وزن جیب میں کیسے رکھا جا سکتا ہے۔اس لیے لوگ رقم کو کسی تھیلی میں ڈال کر کمر بند میں لٹکا لیتے تھے یا اسے آستین میں رکھتے تھے۔اس زمانے میں کرتوں کی آستین بہت کھلی رکھی جاتی تھی اور اسے خفیہ جیب کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔اس کا طریقہ یہ تھا کہ درہموں یا اشرفیوں کو تھیلی میں رکھتے تھے اور تھیلی کو آستین کے اندر کر کے ایک فیتے کے ذریعے بازو یا کلائی کے ساتھ باندھ لیتے تھے۔یوں رقم جیب کتروں سے محفوظ ہو جاتی تھی۔جیب کتروں کا گروہ اس زمانے میں بھی ہوتا تھا۔صدیوں پہلے کی کتبِ فقہ میں جیب کتروں کے شرعی احکام کا ذکر ہے۔عربی میں انہیں ''طرّار'' کہا جاتا تھا۔آج بھی ہمارے ہاں پھرتیلے اور ہوشیار شخص کو ''تیز وطرّار'' کہا جاتا ہے۔

اب ذرا سوچیے کہ آپ نے اپنی آستین میں اس طرح رقم چھپائی ہو تو کون احمق ہوگا جو اس میں ہاتھ گھسا کر پیسے نکالنے کی کوشش کرے۔اور مان لیں کہ کوئی ایسا کرے تو آپ اسے وہیں نہ دھر لیں گے؟ مزے کی بات یہ ہے کہ پرانے زمانے کے جیب کترے ایسے ہوشیار تھے کہ

کبھی کبھار آستین سے بھی اشرفیاں لے اڑتے تھے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔

اب جو جگہ اتنی محفوظ ہو وہاں کوئی سانپ کیسے گھس سکتا ہے؟ اور اگر واقعی کسی کی آستین میں سانپ ہو اور اسے اس کا علم ہی نہ ہو تو اس سے زیادہ بے وقوف کون ہوگا؟ اور اس کی ہلاکت کا خطرہ کس قدر قریب ہوگا۔ اس پس منظر میں اردو زبان کا ایک بڑا خوبصورت محاورہ ہے:

''آستین میں سانپ پالنا۔''

اس کا مطلب ہے اپنے گھر میں یا اپنے قریبی دوستوں کے حلقے میں دشمنوں کو رہنے کا موقع دینا۔ اپنے معاشرے اور اپنے ملک میں غداروں کو پنپنے کا موقع دینا۔

تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کو بیرونی دشمنوں نے کبھی اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا اندرونی غداروں نے پہنچایا۔ ان غداروں کی فہرست بہت طویل ہے۔ جب جب مسلمانوں نے ان غداروں کو پہچان کر کامیاب حکمتِ عملی کے ساتھ ان سے احتیاط برتی اور ان کا گھیراؤ کیا، تب تب وہ ہلاکتوں کے طوفانوں سے بچ بچ کر نکلتے رہے۔ اور جس جس موقع پر انہوں نے ان آستین کے سانپوں سے غفلت اختیار کی، تباہی ان کا مقدر بنی۔ ہماری بڑی بڑی سلطنتیں ان غداروں کے ہاتھوں برباد ہوئیں۔ زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ بہت دفعہ ہم ان غداروں کو بڑے پیار کے ساتھ پالتے پوستے رہے۔ سمجھ دار لوگوں کے سمجھانے پر بھی ہماری آنکھیں نہ کھلیں۔ آخر میں جب ان غداروں کا اصل چہرہ سامنے آیا تو اس وقت تلافی کا کوئی موقع نہ تھا۔

آپ جانتے ہیں کہ کسی باغ کے پھلنے پھولنے کے لیے جہاں پودوں کو بروقت پانی اور کھاد مہیا کرنا ضروری ہوتا ہے، وہیں اسے مضر کیڑے مکوڑوں سے بچانا بھی لازمی ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح کسی ملک یا معاشرے کے استحکام اور بقا کے لیے جہاں اس کی تعمیر و ترقی پر توجہ دینا اہم ہے، وہیں اسے غداروں اور اندرونی دشمنوں سے محفوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ یہ غدار ایسے سانپ ہیں جو انسان کے جسم کے ساتھ چپک کر اس کا خون چوستے ہیں اور آخر میں اسے ڈس کر ہلاک کر

دیتے ہیں۔

اپنے ملک کے نونہالوں اور نوجوانوں کو ان خطرناک عناصر سے خبردار کرنے کے لیے میں نے برسوں پہلے ہفت روزہ ''بچوں کا اسلام'' میں ''آستین کے سانپ'' کے نام سے ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ ہم سب کے ہردل عزیز ادیب، شہرہ آفاق ناول نگار اور ''بچوں کا اسلام'' کے مدیر جناب اشتیاق احمد صاحب مرحوم بھی اس سلسلے کو بہت پسند کرتے تھے۔ یہ سلسلہ بچوں کے ساتھ بڑوں میں بھی بے حد مقبول ہوا۔ اب بھائی فہیم عالم کی خصوصی لگن اور دلچسپی کے ساتھ یہ سلسلہ ایک خوبصورت کتابی شکل میں آپ کے سامنے آرہا ہے۔ مجھے یہ بھی خوشی ہے کہ اس کا سرورق ''بچوں کا اسلام'' کے نامور آرٹسٹ بھائی قیصر شریف صاحب نے بنایا ہے اور واقعی اسے بنانے میں کمال کیا ہے۔ اس مشترکہ محنت کے ساتھ ہم یہ کتاب ملک کے نونہالوں اور نوجوانوں کو اسی جذبے کے ساتھ پیش کررہے ہیں کہ وہ بڑے ہوکر جب اس ملک کے مختلف شعبوں کی باگ ڈور سنبھالیں تو کہیں بھی ان آستین کے سانپوں کو سر اٹھانے کا موقع نہ دیں تاکہ یہ ملک پھولے پھلے اور جس مقصد کے لیے یہ قائم ہوا تھا، وہ اسلام کے عملی نفاذ کی شکل میں پورا ہو۔

محمد اسماعیل ریحان

۲۱ ذیقعدہ ۱۴۴۰ھ

بمطابق 25 جولائی 2019ء

عبداللہ بن اُبیّ

''مٹی مت اڑاؤ۔'' وہ جھلا کر بولا۔

اس وقت حضور نبی اکرم ﷺ کی سواری اس کے قریب سے گزر رہی تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ راستے کے کنارے بیٹھا ہوا تھا، نبی اکرم ﷺ کی سواری کے قدموں سے دھول اُڑ کر اُسے لگی تو وہ بھنا گیا، اس بد بخت کو اندازہ نہیں تھا کہ حضور رحمت عالم ﷺ کا کیا مقام ہے، ان کی سواری کا تو گرد و غبار بھی مشک و عنبر سے بڑھ کر ہے، حضور ﷺ کے ہمراہ چند صحابہ بھی تھے۔ انہوں نے اس کی بدتمیزی کے جواب میں اسے کھری کھری سنا ڈالیں۔ ایک صحابی نے کہا:

''اللہ کی قسم! نبی اکرم ﷺ کے گدھے کی بُو تیرے جسم کی بُو سے ہزار درجے بہتر ہے۔''

۞

حضور نبی اکرم ﷺ سے بدتمیزی کرنے والا یہ شخص عبداللہ بن اُبیّ تھا، یہ شخص اصل میں مدینہ منورہ کے یہودیوں کا سردار تھا، اس کے علاوہ انصار سے بھی اس کی رشتہ داری تھی۔ انصار کے دونوں قبیلوں اوس اور خزرج میں اسے یکساں عزت حاصل تھی۔ اسلام سے پہلے اوس اور خزرج میں نسل در نسل دشمنی چلی آ رہی تھی، دونوں قبیلے ایک طویل عرصے تک لڑتے

لڑتے تھک گئے تو انھوں نے آپس میں صلح کی بات چیت شروع کی اور طے یہ کیا کہ سب مل کر عبداللہ بن اُبَی کو یثرب (مدینہ) کا بادشاہ مان لیں تا کہ وہ مستقل طور پر ایک حکمران کے تحت مجتمع ہو جائیں اور آئندہ کے لئے کسی نا اتفاقی کا امکان نہ رہے۔ مگر اس سے پہلے کہ اوس اور خزرج عبداللہ بن اُبَی کے سر پر بادشاہت کا تاج رکھتے، حج کا موسم آ گیا اور مدینہ منورہ کے بہت سے لوگ حج پر مکہ چلے گئے، وہاں ان لوگوں کی حضور اکرم ﷺ سے ملاقات ہوگئی۔ آنحضرت ﷺ نے انہیں اسلام کی دعوت دی جو انہوں نے قبول کر لی۔ یہ لوگ واپس آئے تو انہوں نے اپنے اپنے خاندانوں اور محلوں میں اسلام کی دعوت کا کام شروع کر دیا اور مدینہ کے مزید گھرانوں میں اسلام پھیل گیا۔ عبداللہ بن اُبَی کی بادشاہت کا معاملہ سب بھول گئے اس لیے کہ اب تو انھیں حضور نبی اکرم ﷺ جیسا بے مثال ہادی اور رہنما مل گیا تھا۔ ادھر عبداللہ بن اُبَی جو کچھ عرصے پہلے اپنی بادشاہت کے خواب دیکھ دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا، اس خلافِ توقع صورتحال پر بے حد جھلایا۔ اس نے انصار کو اسلام سے روکنے کی بڑی کوشش کی مگر کسی نے اس کی بات پر دھیان نہ دیا۔

اِدھر حضور نبی اکرم ﷺ کے حکم سے مہاجرین کی ایک بڑی تعداد مدینہ منورہ آ گئی اور کچھ عرصے بعد خود نبی اکرم ﷺ بھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ تشریف لے آئے۔ سارے مدینہ میں خوشی کا سماں تھا مگر عبداللہ بن ابی دانت پیس رہا تھا۔ کچھ عرصے تک یہ اپنی محفلوں میں مسلمانوں کے خلاف اول فول بکتا رہا... حضور ﷺ کے خلاف اس نے الزام تراشی کا ایک محاذ کھول لیا تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ اس طرح اس کا مقصد حاصل نہیں ہو رہا تو اس کے شیطانی دماغ میں ایک عجیب منصوبہ آیا۔

یہودی عقیدہ رکھنے والا عبداللہ بن اُبی درحقیقت بڑا چالاک، چرب زبان اور مکرو

فریب کا ماہر تھا۔ اس نے اپنے چند ہم خیال لوگوں کے ساتھ مل کر یہ منصوبہ بنایا کہ ہم ظاہری طور پر اسلام کا اعلان کر دیں اور حضور اکرم ﷺ کے ساتھیوں میں شامل ہو جائیں مگر اندر ہی اندر اسلام کی جڑیں کاٹتے رہیں، مسلمانوں کے راز معلوم کر کے کفار کو بتاتے رہیں، ان میں پھوٹ ڈلواتے رہیں اور یہ سلسلہ نسل در نسل جاری رہے۔

چنانچہ عبداللہ بن اُبَیّ نے اسلام لانے کا اعلان کر دیا، اس کے ساتھ اور کئی سو یہودی بھی ظاہری طور پر اسلام لے آئے مگر اندر سے یہ سب پکے کافر تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو مختلف مواقع پر شدید نقصان پہنچایا۔ قرآن وحدیثِ اور شریعت میں ایسے لوگ ''منافق'' کہلاتے ہیں۔ قرآن مجید نے منافقین کو جہنم کے سب سے نچلے اور سب سے خطرناک حصے میں جھونکے جانے کی وعید سنائی ہے۔ عبداللہ بن اُبَیّ ان منافقین کا پیشوا تھا۔ اس نے مسلمانوں کو سب سے پہلے غزوہ احد کے موقع پر دھوکہ دیا۔ احد کی لڑائی کے موقع پر اسلامی لشکر میں ایک ہزار افراد تھے جن میں عبداللہ بن اُبَیّ کے تین سو ساتھی بھی موجود تھے۔ عبداللہ بن اُبَیّ مدینہ منورہ سے باہر کچھ دیر تک مسلمانوں کے ساتھ رہا مگر پھر یہ کہہ کر اپنے 300 ساتھیوں سمیت واپس لوٹ گیا کہ میرا مشورہ تو مدینہ منورہ کی حدود میں رہ کر لڑنے کا تھا، آپ نے میرا مشورہ کیوں نہیں مانا... اس نے یہ بھی واویلا کیا کہ یہ لڑائی نہیں خودکشی ہے، اس نے اور اس کے ساتھیوں نے مخلص مسلمانوں کو بھی جنگ میں شرکت سے روکنے کی کوشش کی۔

خندق کی لڑائی میں جبکہ قریشِ مکہ اور دیگر عرب قبائل نے مدینہ منورہ کا محاصرہ کر لیا تھا، عبداللہ بن اُبَیّ اور اس کے منافق ساتھیوں نے مدینہ کے دفاع کو کمزور کرنے کی پوری کوشش کی۔ صحابہ کرام اور خود حضور نبی اکرم ﷺ سخت سردی اور فاقوں کی حالت میں خندقوں

پر پہرہ دے رہے تھے جبکہ منافقین گھروں میں مزے کر رہے تھے۔ان کا کام صرف یہ رہ گیا تھا کہ مسلمانوں میں افواہوں اور جھوٹی خبروں کے ذریعے بددلی پھیلاتے رہیں۔

ایک غزوہ سے واپسی پر ایک انصاری صحابی اور ایک مہاجر صحابی میں کچھ تلخ کلامی ہوگئی۔عبداللہ بن اُبَی نے اس بات کو خوب اُچھالا، مہاجر صحابہ کو خوب برا بھلا کہا۔اس نے انصار کو مہاجرین کے خلاف بھڑکانے کے لئے عرب کی ایک کہاوت سناتے ہوئے کہا:

''یہ تو وہی بات ہوئی کہ ''سَمِّنْ کَلْبَکَ یَاْ کُلُکَ'' اپنے کتے کو کھلا کھلا کر موٹا کرو گے تو ایک دن وہ تمہیں ہی کھا جائے گا۔تم نے ان مہاجرین کو خوب سر چڑھالیا ہے، اسی لئے یہ تم سے بدتمیزی کر رہے ہیں۔''

پھر اس نے ترنگ میں آکر کہا:

''اللہ کی قسم! مدینہ پہنچتے ہی ہم عزت والے ان ذلیل مہاجرین کو مدینہ سے باہر نکال دیں گے۔''

یہ بات ایک کم عمر صحابی زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کے ذریعے حضور اکرم ﷺ تک پہنچ گئی۔آپ ﷺ نے عبداللہ بن اُبَی کو بلوایا تو اس نے چرب زبانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جھوٹی قسمیں کھا کر کہا:

''میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔اس بچے کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہوگی۔''

ابھی مسلمانوں کا لشکر واپس مدینہ نہیں پہنچا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ المنافقون نازل فرما کر عبداللہ بن اُبَی کا پول کھول دیا اور اسے حد درجے ذلت اٹھانی پڑی۔

عبداللہ بن اُبی کی سیاہ کاریوں میں سے سب سے گھناؤنا جرم یہ تھا کہ اس نے صدیقہ کائنات حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو جو حضور نبی اکرم ﷺ کی سب سے چہیتی زوجہ محترمہ تھیں، بدنام کرنے کے لیئے ان پر بہتان تراشی کی۔ اس واقعے سے حضور نبی اکرم ﷺ، ام المومنین اور تمام مسلمانوں کا صدمے سے برا حال ہوگیا۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے سورۃ النور کے رکوع 2 اور 3 کی آیات نازل فرما کر حضرت ام المومنین کی پاکبازی اور عبداللہ بن اُبی کی سازش کو ظاہر فرمایا۔ اس صورت میں بیان کردہ قانون کے مطابق عبداللہ بن اُبی کو ایک پاکباز مسلمان خاتون پر الزام تراشی کی سزا کے طور پر 80 کوڑے لگائے گئے جبکہ آخرت کی دردناک سزا اس کے علاوہ ہے۔

❂

اپنی سازشوں میں مسلسل ناکامی کا منہ دیکھنے کے بعد منافقین نے خود جناب رسالت مآب ﷺ کو قتل کر دینے کا منصوبہ بنالیا۔ غزوہ تبوک کے موقع پر منافقین کی اکثریت مدینہ منورہ ہی میں رہ گئی تھی مگر کچھ منافقین حضور اکرم ﷺ کے ساتھ چلے گئے تھے، ان کا مقصد یہ تھا کہ موقع پا کر حضور اکرم ﷺ پر حملہ کر دیں۔

غزوہ تبوک سے واپسی کے سفر میں ایک پہاڑ کی تنگ گھاٹی سے مسلمان ایک ایک دو دو کر کے گزر رہے تھے، منافقین وہیں گھات لگا کر بیٹھ گئے، جب حضور اکرم ﷺ کی سواری گھاٹی سے گزرنے لگی تو منافقین نے چہروں پر نقاب اوڑھ کر حضور ﷺ پر حملہ کر دیا۔ مگر اس وقت چند صحابہ کرام وہاں پہنچ گئے، انہوں نے منافقین کو للکارا اور ان کو مار بھگایا۔

حضور اکرم ﷺ نے اپنے ایک صحابی حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کو ان سب منافقین کے نام بتا دیئے تھے جو مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو چکے تھے۔ اس لئے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو
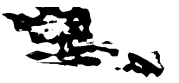
رسول اللہ ﷺ کا راز دار کہا جاتا ہے۔

اپنی بدترین حرکات کے باعث عبداللہ بن اُبی دُنیا میں ذلیل ہو چکا تھا، سب اس سے نفرت کرتے تھے، اس کے باوجود وہ خود کو بدلنے پر تیار نہ ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ اسلام ہی سچا مذہب ہے، مگر پہلے ہی دن سے اس نے حضور نبی اکرم ﷺ کو اپنا مقابل تصور کرلیا تھا، یہ بات اس کے دل سے آخر تک نہ نکلی اور وہ سچے دل سے کبھی اسلام نہ لایا، اس کے کئی منافق ساتھی اپنی حرکات سے تائب ہوکر سچے مسلمان بن گئے تھے مگر اس کی موت کفر ہی کی حالت پر ہوئی۔ اس کے بیٹے ایک سچے اور مخلص صحابی تھے۔ ان کی درخواست پر حضور نبی اکرم ﷺ نے عبداللہ بن اُبی کی تمام سیاہ کاریوں کو بھلا کر اسے اپنے کُرتے میں کفن دیا اور نماز جنازہ بھی پڑھادی۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ التوبہ کی آیت وَلَا تُصَلِّ عَلٰی اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ مَّاتَ اَبَدًا (آپ ان منافقین میں سے کسی مرنے والے کی کبھی نماز جنازہ نہ پڑھایئے گا) نازل فرما کر حضور ﷺ کو آئندہ کے لئے اس سے منع فرمادیا۔

عبداللہ بن اُبی امت مسلمہ کی آستین میں پلنے والا پہلا سیاہ ناگ تھا، اس نے مسلمانوں کو تباہ کرنے کی ایسی خطرناک سازشیں مرتب کی تھیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کی خاص مدد نہ ہوتی اور وحی کے نزول کا سلسلہ نہ ہوتا تو مسلمان آپس میں لڑ کر مر جاتے اور اسلام چند برسوں میں بے نام ونشان ہو جاتا۔ عبداللہ بن اُبی کا ہم خیال یہودی ٹولہ اس کے مرنے کے بعد بھی مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے میں مصروف رہا۔ انہوں نے اگلی صدیوں میں آستین کے بے شمار سانپ مسلمانوں کی صفوں میں چھوڑے جن میں سے کچھ کا تذکرہ ہم آئندہ صفحات پر کریں گے۔

عبداللہ بن سبا

سرزمین عرب سے کفر و شرک کے اندھیرے چھٹ چکے تھے۔ حضرت خالید بن ولید اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما جیسے نامور سپہ سالاروں کی قیادت میں اسلام کے دلیر فرزندوں نے ایران میں کسریٰ کے ایوان اور شام میں قیصر کے اقتدار کو قدموں تلے روند دیا تھا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اڑھائی سالہ دورِ خلافت میں نبوت کے جھوٹے دعوے داروں کو کیفر کردار تک پہنچا کر رہتی دُنیا کے لیے عبرت بنا دیا گیا تھا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خلافتِ اسلامیہ کی سرحدوں کو شمالی افریقہ کے ریگستانوں سے بحیرہ عرب کے ساحل تک وسعت دے دی تھی... اسلام کی اس سربلندی سے دو قومیں خاص طور پر پیچ پا تھیں، ایک ایران کے مجوسی باشندے جو صدیوں سے آگ کی پرستش کرتے آرہے تھے اور دوسرے عرب سے جلاوطن کیے گئے یہودی جو نبوت اور سرداری کو اپنا موروثی حق سمجھ کر حضور نبی اکرم ﷺ اور ان کے وارثوں سے بے انتہا بغض رکھتے تھے۔

چونکہ یہ دونوں دیکھ چکے تھے کہ اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کے سامنے کوئی عسکری قوت حائل نہیں ہوسکتی، اس لیے یہ اسلام کے خلاف زیرزمین سازشوں میں مصروف ہو گئے۔

مجوسیوں میں سے ایک شخص ابولؤلؤ فیروز نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ مجوسیوں کو یقین تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے قائد سے محرومی کے باعث اسلام کی

فتوحات کی رفتار ضرور تھم جائے گی، چنانچہ ابولولؤ نے ایک دن موقع پا کر حضرت عمر ؓ پر، جب کہ وہ نماز فجر کی امامت کرا رہے تھے، قاتلانہ حملہ کیا۔ اس حملے کے بعد انہوں نے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے یکم محرم 24ھ کو شہادت پائی۔

اب حضرت عثمان غنی ؓ خلیفہ بنے۔ ان کی خلافت کے دور میں بھی اسلامی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا، مسلمان امن چین کی زندگی بسر کرتے... لیکن یہودی ذہن مسلمانوں کی عظیم الشان کامیابیوں سے پریشان ہو کر ان کے خلاف سازشوں میں مصروف ہو چکا تھا، یہودی لابی نے مسلمانوں کو آپس میں لڑانے، فرقہ واریت پھیلانے اور ان کی فتوحات کا سلسلہ روکنے کے لیے ایک سازش تیار کی۔ اس سازش کا اصل کردار عبداللہ بن سبا یہودی کو سونپا گیا۔

اس شخص نے حضرت عثمان غنی ؓ کے دور میں جھوٹ موٹ کا اسلام قبول کیا تاکہ مسلمانوں کی صفوں میں گھس کر اپنا کام کر سکے۔ اس کے ہم خیال لوگوں کی پوری ایک جماعت اس کے ساتھ تھی۔

اس دور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کافی تعداد میں موجود تھے، اس لیے مسلمانوں کو آپس میں لڑانا کوئی آسان کام نہیں تھا، خاص طور پر عرب علاقوں میں یہ کام اور بھی مشکل تھا، کیونکہ وہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، ان کی اولاد اور ان کے شاگرد آباد تھے، اس لیے ان لوگوں نے یہ سازش دور دراز علاقوں سے شروع کی، وہ اُن علاقوں میں پھیل گئے جہاں کے لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، انھیں دین کا زیادہ علم نہیں تھا اور ان کے ایمان اتنے پختہ نہیں تھے۔ ایران اور عراق کا علاقہ ان کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوا، وہاں اب بھی آتش پرست لوگ بڑی تعداد میں موجود تھے۔ وہاں دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں لوگ عبداللہ بن سبا

کے عقیدت مند بن گئے۔

عراق کے شہر بصرہ کے حاکم عبداللہ بن عامر کو ابن سبا کی حرکتوں کا علم ہوا تو انھوں نے اسے شہر سے نکال دیا، وہ بصرہ سے کوفہ پہنچ گیا۔ وہاں بھی وہ اپنی سازشوں میں مصروف ہوگیا۔ کوفہ کے حاکم کو اس کی سازشوں کا پتا چلا تو انھوں نے بھی اسے نکال باہر کیا۔ اب یہ مصر پہنچا، یہاں بھی اس نے اپنے نظریات پھیلانے شروع کر دیے۔ اس نے ان لوگوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ ان پر جھوٹے الزام لگا کر لوگوں کو ان سے نفرت دلائی، لوگوں میں غلط عقیدے پھیلائے۔ حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم پر سے ان کا اعتماد ختم کرنے کی ترکیبیں اختیار کیں اور مشہور کیا کہ خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق تھا جس پر یہ تینوں حضرات ناجائز قبضے کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 35 ھ کے آخر میں جب حج کے موسم میں مدینہ منورہ کے اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حج کے لیے مکہ معظمہ گئے ہوئے تھے... عبداللہ بن سبا کے حامیوں کی ایک بڑی جماعت مدینہ منورہ میں گھس گئی۔ ان لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ کرلیا۔ 17 دن تک انہیں بھوکا پیاسا رکھنے کے بعد آخر 18 ذوالحجہ 35 ھ میں شہید کر ڈالا۔

اس طرح عبداللہ بن سبا کی سازش کامیاب ہوگئی، مسلمانوں میں فرقہ بندی کا آغاز ہوگیا، جہاں اکثر لوگ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت کرنے والے تھے، وہاں بڑی تعداد میں ایسے لوگ بھی سامنے آگئے جو خلفاء راشدین کے مخالف تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے۔ اب عبداللہ بن سبا نے اپنی سازش کو نیا رنگ دیا، وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عقیدت کا شور پہلے سے بھی زیادہ مچانے لگا، اس کے کارکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سچے جانثاروں کے ہجوم میں شامل ہوگئے۔ دوسری طرف اس کے ایجنٹوں نے یہ مشہور کر دیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرا کے خود خلافت پر قابض ہو گئے ہیں۔ یہ بات زیادہ تر شام اور عراق میں پھیلائی گئی جس کے باعث شام میں تو لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے بالکل انکار کر دیا جبکہ عراق میں بھی بہت سے لوگ اسی طرح کے شکوک وشبہات کا شکار ہو گئے۔

اس دوران حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اورام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا مسلمانوں کے ایک بڑے قافلے کے ساتھ عراق کے شہر بصرہ پہنچ گئی تھیں۔ وہاں انہوں نے حضرت عثمان سے بغاوت کرنے والے بہت سے فسادیوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ اس دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی عراق کے حالات تشویش ناک دیکھ کر عراق کے دوسرے بڑے شہر کوفہ تشریف لے گئے اور سفیر بھیج کر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اورام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مذاکرات کیے۔ ان حضرات نے بتایا کہ ہمارا مطالبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فقط اتنا ہے کہ وہ جلد از جلد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو گرفتار کریں تاکہ مسلمانوں کی بے چینی ختم ہو سکے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سفیر نے انہیں یقین دلایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس سلسلے میں ہرگز کوئی کوتاہی نہیں کریں گے۔ اس پر یہ سب حضرات بہت خوش ہوئے اور اتفاق کی اچھی صورت نکل آئی۔

ابن سبا کی جماعت کے لوگ یہ بات سن کر بہت گھبرائے، کیونکہ اس طرح ان سب کی گرفتاری عمل میں آتی اور ان سے بدلہ لیا جاتا، چنانچہ اس معاملے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی توجہ ہٹانے کے لیے فیصلہ کیا گیا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے قافلے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج کو آپس میں لڑا دیا جائے، چنانچہ راتوں رات سازش طے پا گئی۔

رات کی تاریکی میں ابنِ سبا کے کارکنوں کے ایک گروہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں

کھڑے ہو کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قافلے پر تیر برسا دیے، دوسری طرف ان کے دوسرے گروہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے قافلے میں کھڑے ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خیمہ گاہ پر تیروں کی بارش کر دی۔ اب ہوا یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر والے یہ سمجھے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھیوں نے ان پر حملہ کر دیا ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھیوں نے خیال کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج نے ان پر حملہ کر دیا ہے، چنانچہ دونوں طرف سے تلواریں نکل آئیں، مسلمان آپس میں ٹکرا گئے، ایسے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پکار پکار کر کہہ رہے تھے:

''لوگو! رُک جاؤ۔''

حضرت عائشہ بھی لڑائی رکوانے کے لیے اپنے اونٹ پر بیٹھ کر آگے تشریف لائیں، مگر اس وقت تک جنگ شروع ہو چکی تھی۔ اس جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے بڑے بڑے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دوسرے نیک مسلمان شہید ہو گئے۔ یہ عبداللہ بن سبا کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ اس جنگ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اونٹ پر سوار تھیں، اس لیے یہ واقعہ جنگِ جمل کے نام سے مشہور ہو گیا۔

اس لڑائی کے بعد بھی عبداللہ بن سبا اور اس کے گروہ نے اپنا کام جاری رکھا، انھوں نے مسلمانوں کو دو نئے فرقوں میں تقسیم کر دیا، ان میں سے ایک فرقہ تو وہ تھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت میں بے انتہا گمراہ ہو گیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نعوذ باللہ خدا کہنے لگا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسے کئی آدمیوں کو گرفتار کر کے انھیں قتل کرایا۔ دوسرا فرقہ وہ تھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نفرت کرتا تھا۔ پھر ان نفرت کرنے والوں کے دو گروہ تھے۔ ایک میں وہ لوگ تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نفرت تو کرتے تھے مگر انہیں کافر نہیں کہتے تھے۔ بس انہیں برا بھلا کہا کرتے

تھے۔ یہ لوگ مروانی یا ناصبی کہلائے۔ یہ زیادہ تر شام میں رہتے بستے تھے۔ ان کا دوسرا گروہ وہ تھا جس کے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اتنی نفرت کرتے تھے کہ انہیں نعوذ باللہ کافر اور مشرک قرار دیتے تھے اور جو انہیں نیک اور عادل مانتا تھا، اسے بھی کافر کہتے تھے اور اسے قتل کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر عراق میں تھے اور انہیں خارجی کہا جاتا تھا۔ ان کے عقاید بھی بالکل غلط تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں ان لوگوں نے بڑا فساد مچایا اور بے شمار بے گناہ لوگوں کو قتل کیا۔

غلط فہمیوں کے اس ماحول کے باعث حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلاف بڑھتا گیا اور صلح کی کوئی صورت نہ رہی۔ دونوں طرف سے سپاہی جمع کیے گئے اور صفین کے مقام پر دونوں لشکر جمع ہوئے۔ اگر چہ دونوں طرف کی قیادت میں بڑے بڑے صحابہ تھے اور سپاہیوں میں ہزاروں تابعین تھے جو نیک نیتی کے ساتھ ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہوئے تھے مگر انہی میں عبداللہ بن سبا کے ایجنٹ بھی گھلے ملے ہوئے تھے جنہوں نے معاملے کو زیادہ خراب کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور صلح کے تمام امکانات کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک بڑی جنگ چھڑ گئی جس میں ہزاروں مسلمان شہید ہوئے۔

سبائیوں کے بہکانے میں آکر ''خوارج'' نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت شروع کردی اور آخرکار حضرت علی رضی اللہ عنہ انہی لوگوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ عبداللہ بن سبا کا انجام کیا ہوا؟ اس کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے الملل والنحل میں بتایا ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے زمانے (یعنی 40ھ) تک زندہ تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے کچھ عرصے بعد 40ھ میں وہ جہنم رسید ہوا۔ جبکہ بعض مورخین کے خیال کے مطابق

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی ہی میں اسے زندہ جلا دیا تھا۔

چاروں خلفائے راشدین کے بعد عبداللہ بن سبا کی پارٹی کا کام اور زیادہ آسان ہو گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد خلافت حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو ملی، لیکن اب صورتِ حال یہ ہوگئی کہ شام اور مصر کے اسلامی علاقوں میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت تھی اور مکہ، مدینہ اور حجاز میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی۔ عبداللہ بن سبا کے پیروکاروں نے ان دونوں کو بھی لڑانے کی کوشش کی، لیکن حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت چھوڑ دی۔ انھوں نے صرف چھ ماہ تک خلافت سنبھالی پھر خلافت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو سونپ دی۔ تا کہ سازشی عناصر مسلمانوں کو مزید نہ لڑا سکیں۔ اس طرح عالمِ اسلام میں پھر سے مضبوطی کا دور آیا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ زبردست سیاست دان اور رعب و دبدبے والے آدمی تھے۔ ان کے 21 سالہ دور میں عبداللہ بن سبا کے پیروکاروں کو کچھ کرنے کا موقع نہ ملا۔ رجب 60 ہجری میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے وفات پائی تو ابن سبا کے لوگ ایک بار پھر حرکت میں آ گئے۔ انھوں نے خوشیاں منائیں، مٹھائیاں تقسیم کیں، افسوس! یہی جہالت کی رسم اب مسلمان بھی مناتے ہیں جس کو کونڈے کہا جاتا ہے۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے یزید کے دور میں سبائی گروہ پھر حرکت میں آ گیا۔ ایک طرف ان کی سازشوں اور دوسری طرف یزید کی نالائقی اور اس کے گورنروں کی سخت مزاجی اور سنگ دلی کے باعث سانحۂ کربلا پیش آیا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ ان کے اہلِ خانہ، رشتے داروں اور ساتھیوں کو میدانِ کربلا میں شہید کر دیا گیا۔

غور کیا جائے تو عبداللہ بن سبا امتِ مسلمہ کے حق میں عبداللہ بن ابی سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوا، کیونکہ عبداللہ بن ابی کی سازشوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے

حضورِ اکرم ﷺ کو خبر دار کر دیتے تھے، اس لیے اس کی اکثر سازشیں نا کام ہو جاتی تھیں، مگر عبد اللہ بن سبا کی سازشوں نے مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا، فرقہ بندیوں کے ناسور میں مبتلا کر دیا اور آج تک اس کا علاج نہیں ہو سکا۔

❁❁❁

حسن بن صباح

صدیوں پرانی بات ہے کہ ایران کے ایک نامور عالم دین امام موثق الدین کی درس گاہ میں تین طالب علم اپنی نصابی تعلیم کے آخری مرحلے میں تھے، یہ تینوں غیر معمولی ذہین اور قابل تھے۔ کچھ مدت بعد ان کی تعلیم مکمل ہوئی تو وہ مچلتی امنگوں، بلند عزائم اور اساتذہ کی دعاؤں کے ساتھ درس گاہ سے رخصت ہوئے، تینوں نے الگ الگ راستہ اختیار کیا اور دور دراز کے شہروں کی طرف چل دیے۔

ان میں سے ایک طالب علم کو ریاضی، فلسفے اور شاعری سے خاص دلچسپی تھی، اس نے انہی شعبوں میں طویل عرصے تک کام کیا، اور آخر کار دُنیا کے گنے چنے ریاضی دانوں، شاعروں اور فلسفیوں کی صف میں جا کھڑا ہوا، آج بھی دُنیا اسے عمر خیام کے نام سے جانتی ہے اور یورپ کی یونی ورسٹیوں میں اس کے فلسفے پر مستقل شعبے قائم ہیں۔

دوسرا طالب علم اس سے بھی زیادہ خوش قسمت نکلا، اسے اپنے وقت کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کے دربار میں ملازمت مل گئی، یہ سلجوقی سلطنت کہلاتی تھی، جس کی حدود وسط ایشیا، خراسان، ایران اور عراق کے علاوہ موجودہ ترکی کے علاقوں تک پھیلی ہوئی تھیں، یہ طالب علم اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر آخر کار سلطنتِ سلجوقیہ کے بادشاہ سلطان ملک شاہ کا وزیراعظم بن گیا اور نظام الملک طوسی کے نام سے مشہور ہوا، اس نے سلجوقی سلطنت

کا نظام اس خوبی سے چلایا کہ ہر طرف سکھ اور چین کا دور دورہ ہو گیا، علم و ادب کی بہار آ گئی، لوگ اسے دعائیں دینے لگے، اس نے بغداد میں دُنیا کا سب سے بڑا دار العلوم تعمیر کرایا جو'' مدرسہ نظامیہ'' کے نام سے مشہور ہوا۔

تیسرا طالب علم سب سے زیادہ ہوشیار اور تیز طبع تھا، مگر اس کے خیالات منفی قسم کے تھے، اس کا نام حسن بن صباح تھا، وہ بڑائی کا خواہش مند تھا اور کسی کی پیروی کو اپنے لیے عار سمجھتا تھا۔ اپنے اس مزاج کی وجہ سے ایک مدت تک وہ کوئی کام نہ کر سکا اور مارا مارا پھرتا رہا، انہی دنوں اسے معلوم ہوا کہ اس کا دوست نظام الملک سلجوقی سلطنت کا وزیر بن چکا ہے، یہ فوراً شاہی محل پہنچا اور ملازمت کی درخواست دے دی، دوستی کی لاج رکھتے ہوئے نظام الملک نے اسے ایک بڑے عہدے پر فائز کر دیا۔

ایک دن سلطان ملک شاہ نظام الملک سے کہنے لگا:

''تم ایک ایسی رپورٹ تیار کرو جس میں تمام صوبوں کے ہر ہر شعبے کی آمدنی اور خرچ کی تفصیل ترتیب وار آ جائے۔''

''جی بہتر!'' نظام الملک نے ادب سے جواب دیا۔

''یہ کام کتنے دن میں ہو جائے گا'' ملک شاہ نے بے چینی سے پوچھا۔

''بادشاہ سلامت! اس کام میں دو برس لگیں گے۔'' نظام الملک نے کام کی وسعت اور مشکلات کو سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ ان مشکلات کی وضاحت کرتا، حسن بن صباح بول پڑا:

''حضور! اگر آپ یہ کام میرے حوالے کر دیں تو خادم صرف چالیس دن میں اسے انجام دے سکتا ہے۔''

یہ کہتے ہوئے حسن بن صباح نے نظام الملک پر ایک طنزیہ نگاہ ڈالی، دراصل وہ نظام الملک کے مرتبے سے جلتا تھا اور اسے ذلیل کرنا چاہتا تھا۔

ملک شاہ نے حیران ہو کر حسن بن صباح کو دیکھا اور پھر کچھ سوچ کر یہ کام اسی کے حوالے کر دیا۔ اس طرح نظام الملک پر بھرے دربار میں نااہلیت کا الزام لگ گیا مگر وہ خاموش رہا۔ 40 دن بعد حسن بن صباح نے ایک لمبی چوڑی رپورٹ بادشاہ کی خدمت میں پیش کی، نظام الملک ایک طرف اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کر رہا تھا، وہ سوچ رہا تھا، اگر یہ رپورٹ بادشاہ کو اچھی لگی تو مجھے نااہل قرار دے کر ملازمت سے برطرف کر دیا جائے گا، مگر ملک شاہ بھی بڑا جہاں دیدہ اور عالم فاضل حکمران تھا، اس نے رپورٹ کے چند صفحات پلٹنے کے بعد حسن بن صباح سے اس کے کچھ امور کی تفصیل پوچھی، حسن بن صباح کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں، وہ کوئی اطمینان بخش جواب نہ دے سکا، اس کا مطلب یہ تھا کہ رپورٹ درست اور حقائق پر مبنی نہ تھی۔ یہ منظر دیکھ کر نظام الملک نے عرض کیا:

''بادشاہ سلامت انہی مشکلات کے پیش نظر میں نے دو سال کا وقت مانگا تھا تاکہ ہر ہر چیز کی اچھی طرح تحقیق کی جا سکے۔''

بادشاہ نے اسی وقت حسن بن صباح کو دربار سے نکال دیا اور نظام الملک کا مرتبہ مزید بڑھ گیا۔

حسن بن صباح نے نظام الملک اور سلجوقی سلطنت کی دشمنی دل میں رکھ لی۔ اب وہ خود ایک مضبوط قوت بن کر انھیں ختم کرنا چاہتا تھا۔ انہی دنوں اسے ایک باطل فرقے ''فرقہ اسماعیلیہ'' کے افراد سے رابطے کا موقع مل گیا اور یہ اس فرقے میں شامل ہو گیا، رفتہ رفتہ یہ

اس فرقے کا مذہبی پیشوا بن گیا، اب اس نے شمالی ایران کے بلند و بالا کوہستان میں ''الموت'' نامی ایک قلعے کو اپنا مرکز بنالیا۔ یہاں اس نے اسماعیلی فرقے کے عقائد میں کچھ تبدیلیاں کر کے ''باطنیہ'' کے نام سے ایک نیا فرقہ بنایا۔

قلعہ الموت دشوار گزار پہاڑوں کے درمیان ایک نہایت بلند چوٹی پر واقع تھا، اس لیے کسی فوج کا اس پر قبضہ کرنا بہت مشکل تھا، حسن بن صباح نے اس محفوظ ترین جگہ پر ایک عجیب پروگرام ترتیب دیا، تاکہ اپنے پیروکاروں کو مکمل طور پر اپنی مٹھی میں رکھ سکے۔ اس نے اونچی دیواروں میں گھرا ہوا ایک نہایت خوبصورت باغ بنوایا، اس باغ میں داخل ہوتے ہی ہر طرف وسیع سبزہ زار، طرح طرح کے درخت، رنگارنگ پھول اور ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے دکھائی دیتے تھے... اس کے نہایت خوبصورت محلات، انسان کو حیران کر دیتے تھے۔ یہاں سینکڑوں قسم کے پرندوں کی چہکار گونجا کرتی تھی اور خدمت گار باندیاں ناچ گانے، موسیقی اور شراب کے ساتھ لوگوں کا دل بہلانے کے لیے موجود رہتی تھیں۔

حسن بن صباح نے اس جگہ کو ''جنت'' کا نام دیا تھا، اسے جن لوگوں سے کوئی اہم کام لینا ہوتا تھا، انھیں بھنگ پلا کر بے ہوش کر دیا جاتا اور پھر اس نقلی جنت میں لا کر کچھ دن خوب عیش و عشرت میں رکھا جاتا، کچھ دنوں بعد انھیں بے ہوش کر کے دوبارہ حسن بن صباح کے سامنے پیش کیا جاتا، وہ ان سے کہتا:

''اگر جنت میں دوبارہ جانا چاہتے ہو تو ہمارے حکم پر جان فدا کرنے کے لیے تیار رہو۔''

ایسے لوگ واقعی اس نقلی جنت کو اصل سمجھ کر حسن کے حکم پر جان قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے۔ ان لوگوں کو ''فدائی'' کہا جاتا۔

حسن بن صباح نے ان فدائیوں کے ذریعے عالم اسلام کی بڑی قیمتی شخصیات اور اپنے بہت سے مخالفین کو موت کے گھاٹ اتارا، اس کی کارستانیوں سے پورے عالم اسلام کے حکمران، امراء، علماء اور نامور شخصیات کا جینا دوبھر ہو گیا۔

ملک شاہ بھی حسن بن صباح کی سیاہ کاریوں سے تنگ آ چکا تھا، اس نے نظام الملک طوسی کو ایک لشکر دے کر حسن بن صباح کی سرکوبی کے لیے، الموت کی طرف روانہ کیا۔ حسن بن صباح نے یہ اطلاع پا کر ایک ''فدائی'' کو نظام الملک کو شہید کرنے کا کام سونپ دیا۔

یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ لشکر ایک جگہ رُکا ہوا تھا اور مغرب کا وقت ہو چکا تھا، نظام الملک افطار سے فارغ ہو کر اپنے خیمے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ یہ فدائی فقیر کی سی صورت بنا کر سامنے آ گیا، نظام الملک نے اسے فریادی اور مصیبت زدہ سمجھ کر قریب بلا لیا، فدائی آگے بڑھا اور پلک جھپکتے میں ایک تیز دھار خنجر نظام الملک کے سینے میں گھونپ دیا۔ وار اتنا کاری تھا کہ نظام الملک نے وہیں دم توڑ دیا۔ اس نے تیس سال وزارت کی خدمات انجام دی تھیں، اس کی عمر 77 سال تھی۔ نظام الملک کے قتل کے بعد حسن بن صباح نے عالم اسلام کی اور کئی نامور شخصیتوں کو اسی طرح قتل کرایا۔

518ھ (1124ء) میں حسن بن صباح مر گیا مگر اس کے جانشینوں نے اس کا کام جاری رکھا، ''الموت'' قلعے پر کئی حکمرانوں نے فوج کشی کا منصوبہ بنایا، مگر کوئی اس قلعے کو فتح نہ کر سکا۔

سلطان شہاب الدین غوری جیسے نامور مسلم سلاطین حسن بن صباح کے فدائیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے، سلطان صلاح الدین ایوبی جیسے مجاہد پر انہوں نے قاتلانہ حملے کیے، امام

فخر الدین رازی رحمتہ اللہ علیہ جیسے محقق علماء ان کی دھمکیوں کی گونج اور خنجروں کے گھیرے میں زندگی بسر کرتے رہے۔

حسن بن صباح کی غداری کا بویا ہوا کڑوا پھل تقریباً دو صدیوں تک امت مسلمہ کے لیے وبالِ جان رہا، آخر کار 656ھ میں جب ہلاکو خان نے عراق پر حملہ کیا تو اس دوران اس کا گزر قلعہ الموت سے ہوا، اس کے حکم پر تاتاریوں نے اس قلعے پر قبضہ کر لیا اور اس کے تمام افراد کو قتل کر کے باطنیوں کے اس مرکز کا خاتمہ کر دیا۔ اس طرح غداروں کی یہ کھیپ ایک کافر حکمران کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچی۔

خلیفہ ناصر

امت مسلمہ کو اپنی تاریخ میں جن سخت ترین حوادث کا سامنا کرنا پڑا، ان میں تاتاریوں کا فتنہ سب سے زیادہ خطرناک تھا، جنہوں نے اپنے سردار چنگیز خان کی قیادت میں 616ھ میں عالم اسلام پر حملہ کیا اور آدھی سے زیادہ اسلامی دُنیا کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ عالم اسلام پر چنگیز خان کے حملے کے وقت اسلامی دُنیا کی سب سے بڑی سلطنت ''خوارزم'' تھی جو افغانستان ایران اور وسط ایشیا کے علاقوں پر مشتمل تھی اور اس کی فوج 4 لاکھ سے کم نہ تھی، اس کے باوجود ''خوارزم'' کا بادشاہ علاؤ الدین محمد چنگیز خان کا مقابلہ نہ کر سکا۔ اور تاتاریوں کا سیلاب یوں آگے بڑھتا چلا گیا کہ 40 سال کے اندر اندر اسلامی دُنیا کے اکثر ممالک تاتاریوں کے قبضے میں چلے گئے، ہزاروں مساجد اور مدارس پیوندِ خاک ہو گئے، کتب خانے جلا دیے گئے اور اسلامی تہذیب وتمدن کا چھ سو سالہ ریکارڈ بے نام ونشان ہو گیا۔ اس تباہی کے ذمہ داروں میں پانچ بڑے غداروں کا سب سے زیادہ حصہ رہا ہے۔ ان سب کا تذکرہ ہم نمبر وار کرتے ہیں۔

(ا) خلیفہ ناصر: یہ عباسی خاندان کا خلیفہ اور بغداد کا حکمران تھا... اس کے آباؤ اجداد اور اولاد سب اہل سنت والجماعت سے تعلق رکھتے تھے مگر خود اس کے عقائد بگڑے ہوئے تھے، ویسے یہ بڑا عالم فاضل اور شاعر وادیب قسم کا آدمی تھا مگر اس کے اشعار میں مسلمانوں

کے متفقہ عقائد سے برگشتگی اور حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم سے بغض وعناد کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ اس کے پڑوس میں خوارزم کی حکومت تھی جس کے حنفی حکمران علاؤالدین محمد خوارزم شاہ کی زبردست قوت سے یہ ہمیشہ حسد کرتا رہتا تھا۔ یہی وہ دن تھے جب چنگیز خان نے چین پر قبضہ کر کے ایک وسیع سلطنت قائم کرلی تھی، اور اس کی ہیبت اور خونریزی سے تمام پڑوسی ممالک اسی طرح خوفزدہ تھے جیسے آج مسلم ممالک امریکہ سے ڈرتے ہیں۔ خلیفہ ناصر نے اس موقع پر امت سے غداری کا ثبوت یوں دیا کہ پڑوسی اسلامی ممالک سے مل کر چنگیز خان کے خلاف اتحاد کرنے کی بجائے چنگیز خان کو خط لکھا کہ اگر وہ ''خوارزم'' پر حملہ کردے تو بغداد کی حکومت اس کے ساتھ ہوگی۔ چوں کہ چنگیز خان تک اس خط کو لے جانے والے قاصد کو خوارزم کی حدود سے گزر کر جانا تھا اس لیے خلیفہ ناصر نے بڑی عیاری سے کام لیتے ہوئے اس خط کو کاغذ کی بجائے قاصد کے سر پر لکھوایا، اس کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ قاصد کا سر مونڈ کر اس کی کھال پر گرم سوئی سے پیغام کے الفاظ کندہ کرادیے گئے اور مہر بھی لگادی گئی۔ جب چند ہفتوں میں قاصد کے بال بڑھ گئے تو اسے روانہ کردیا گیا۔ خوارزم کی سرحدوں پر اس کی تلاشی کے باوجود کوئی خط برآمد نہ کیا جاسکا اور پیغام چنگیز خان تک پہنچ گیا۔ اس طرح بغداد نے اسلامی ملک ہونے کے باوجود ایک اسلامی ملک کو ختم کرنے کے لئے چنگیز خان کا ساتھ بالکل اسی طرح دیا جیسے افغانستان کی طالبان حکومت کے خلاف امریکہ حملے کے وقت پڑوسی مسلم ممالک نے امریکا کا ساتھ دیا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ چنگیز خان نے جب 8.7 لاکھ فوج کے ساتھ خوارزم پر حملہ کیا تو خوارزم کا بادشاہ علاؤالدین محمد اس کا مقابلہ نہ کرسکا اور یوں بخارا، سمرقند، مرو، قوقند اور نیشاپور جیسے

بڑے بڑے اسلامی شہر تاتاری درندوں کے ہاتھوں اس طرح پامال ہو گئے کہ ان میں ڈھونڈے سے بمشکل کوئی شخص زندہ ملتا تھا۔

جب خلیفہ ناصر خوارزم پر چنگیز خان کو حملے کی دعوت دے رہا تھا تو اس وقت ایک درباری نے اسے سمجھایا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو چنگیز خان خوارزم پر حملے کے بعد بغداد کو بھی نہ چھوڑے۔ مگر خلیفہ ناصر نے اس کے خدشے کو کوئی اہمیت نہ دی۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایسا ہی ہوا اور خوارزم کے بعد بغداد بھی تاتاریوں کے ہاتھوں تباہی کا شکار ہوا۔

خلیفہ ناصر کا اپنا انجام بہت برا ہوا۔ خوارزم کی تباہی کے چند برس بعد جب کہ بغداد کا تاتاریوں سے دوستی کا سلسلہ جاری تھا، اس پر فالج کا شدید حملہ ہوا، دو تین سال تک وہ بے حس و حرکت بستر پر پڑا رہا... پھر اس کے مثانے میں اتنی سخت پتھری پیدا ہو گئی کہ جراح کو مثانے کا آپریشن کرنا پڑا... آپریشن ناکام ہوا اور لاکھوں مسلمانوں کے کشت و خون کا ذمہ دار یہ غدار تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

خلیفہ ناصر نے اپنے دورِ حکومت میں بغداد اور دیگر شہروں سے عسکری کھیل کود مثلاً تلوار بازی، نیزہ بازی اور گھڑ سواری کی جگہ کبوتر بازی جیسے فضول مشاغل کو رواج دیا۔ جب تاتاری بخارا اور سمرقند میں مسلمانوں کے سر کاٹ رہے تھے، خلیفہ ناصر کبوتر بازی سے دل بہلا رہا تھا، خلیفہ کی اس بدذوقی کے باعث عراق اور دیگر علاقوں کے مسلمان جہاد کے بجائے کھیل تماشوں کے عادی ہو گئے اور جب تاتاریوں نے ان پر حملہ کیا تو وہ اپنے دفاع کے لیے کچھ نہ کر سکے۔

خلیفہ ناصر نے حق گو علماء پر بھی مظالم ڈھائے، علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ جیسے جلیل القدر عالم کو اس نے جلاوطن کر کے شدید تکالیف میں مبتلا کیا۔ خلیفہ کی ان حرکات کا خمیازہ

خود اس کے جانشینوں کو بھی بھگتنا پڑا اور کچھ عرصے میں اس کی نسل سے بادشاہت چھن گئی اور بغداد جیسا عظیم شہر تاتاریوں کے حملے میں تباہ و برباد ہو گیا۔

بدرالدین عمید

خوارزم کے بادشاہ علاؤالدین محمد نے چنگیز خان کے قاصد کو قتل کر کے اسے خود حملے کا بہانہ فراہم کیا تھا اور پھر اس کے مقابلے میں بہت کمزور حکمت عملی اپنائی تھی، جس کی وجہ سے اسے مسلسل شکست ہوتی رہی۔ اس کا یہ کردار مسلمانوں کے نزدیک قابل نفرت رہا ہے اور مؤرخین اس بات پر اسے سخت تنقید کا نشانہ بناتے رہے ہیں۔ خوارزم شاہ کی ان کمزوریوں سے تو ایک دُنیا واقف ہے مگر یہ بات کم لوگ جانتے ہیں کہ اس کی شکست میں اس کی اپنی ناسمجھی کے علاوہ سب سے بڑا ہاتھ کچھ غداروں کا تھا۔ ان غداروں میں بدرالدین عمید کا نام سرفہرست ہے۔

بدرالدین عمید خوارزم شاہ کا درباری تھا، جب چنگیز خان نے بخارا کے بعد سمرقند پر بھی قبضہ کرلیا تو بدرالدین کو خوف محسوس ہوا کہ اب چنگیز خان جلد ہی پورے ملک پر قبضہ کرلے گا، اس نے حالات کا رُخ دیکھ کر مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ دیا اور چنگیز خان کا وفادار بن گیا۔ یہ بڑا چالاک انسان تھا، اس نے چنگیز خان کو ایسی عجیب ترکیب بتائی جس سے مسلمانوں میں پھوٹ پڑ سکتی تھی۔ خوارزم کی فوج میں سب سے طاقتور حصہ قپچاقی ترک قبیلے کا تھا۔ بدرالدین عمید نے چنگیز خان کو سمجھایا کہ کسی طرح قپچاقی ترک سرداروں اور خوارزم شاہ میں بداعتمادی پیدا کردی جائے تو آپ کے لئے یہ ملک فتح کرنا بالکل آسان ہو جائے

گا۔ دراصل خوارزم کی فوج تین چار مقامات پر شکست کھانے کے باوجود اب بھی ڈھائی تین لاکھ سپاہیوں پر مشتمل تھی اور اگر خوارزم شاہ کا بیٹا جلال الدین اس کی قیادت کرتا تو یہ فوج تاتاریوں کو شکست دینے کی صلاحیت بھی رکھتی تھی۔ ایسے حالات میں چنگیز خان مسلمانوں کی فوج میں پھوٹ ڈالنا بہت ضروری سمجھتا تھا مگر اس کام کے لئے اس سے پہلے اسے کوئی غدار میسر نہیں آیا تھا تاہم اب بدرالدین عمید جیسا غدار اس کے ہاتھوں میں تھا۔ چنگیز خان نے بڑی خوشی کے ساتھ بدرالدین کو اس کام کے لئے منصوبہ ترتیب دینے کی اجازت دی۔

اب بدرالدین نے ایک جعلی خط تیار کرایا۔ اس خط کا مضمون ایسا تھا جیسے یہ خوارزمی فوج کے قپچاقی ترک سرداروں کی جانب سے چنگیز خان کے نام ہو، اس خط میں تحریر تھا کہ ہم قپچاقی ترک قبیلے کے بہادر افراد علاؤالدین محمد خوارزم شاہ کی حکومت سے بہت تنگ ہیں اور خانِ اعظم چنگیز خان کے وفادار ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ خوارزم شاہ کی حکومت ختم ہوجائے اور آپ اس ملک کے حکمران بن جائیں۔ اس سلسلے میں ہم آپ سے ہر تعاون کے لئے تیار ہیں۔

بدرالدین نے یہ خط اپنے ایک کارکن کے حوالے کیا اور اسے کہا:

''یہ خط لے کر خوارزمی فوج کی کسی چوکی کے پاس سے گزرو... وہ تمہاری تلاشی لیں گے اور یہ خط برآمد کر کے خوارزم شاہ کو پیش کر دیں گے۔ تم سے پوچھ گچھ کی جائے تو تم بھی یہی کہنا کہ یہ خط قپچاقی ترک افسران مجھے دے کر چنگیز خان کے پاس بھجوا رہے تھے۔''

کارکن نے اس حکم پر عمل کیا... وہ ایک چوکی کے پاس سے گزرا جہاں اس کی تلاشی لی گئی... خط برآمد ہوگیا۔ سپاہیوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ کارکن نے منصوبے کے مطابق

سرکاری افسران کو یہی بتایا کہ میں یہ خط فوج کے فلاں فلاں امراء کی جانب سے چنگیز خان کے پاس لے جا رہا تھا۔ اب یہ خط خوارزم شاہ کے سامنے پیش کیا گیا... اس کے غصے کی انتہا نہ رہی... اس نے قپچاقی ترک امراء کو سخت برا بھلا کہا اور طے کرلیا کہ انہیں غداری کی بدترین سزا دی جائے گی۔

اِدھر ان ترک امراء کو جب یہ معلوم ہوا تو ان کے ہوش اُڑ گئے۔ ان پر غداری کا جھوٹا الزام لگایا جا رہا تھا۔ انہوں نے تو ایسا کوئی خط لکھا ہی نہیں تھا۔ ادھر بادشاہ کے غصے کا عالم دیکھتے ہوئے اس کے سامنے کچھ کہنا فضول تھا۔ انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا:

''غداری کا الزام تو ہم پر لگ ہی چکا ہے، کیوں نہ ہم خوارزم شاہ کو قتل کر دیں... اگر ہم نے فوراً اسے قتل نہ کیا تو کل وہ ہمیں سزائے موت دے دے گا...''

یہ سوچ کر انہوں نے اپنے سپاہیوں کے ذریعے بادشاہ کے خیمے پر تیروں کی بارش شروع کر دی... بادشاہ کو اس سازش کا کچھ لمحوں پہلے علم ہو گیا تھا، اس لیے وہ خیمے سے نکل گیا تھا۔ اِدھر ترک سرداروں کو جب پتا چلا کہ بادشاہ بچ کر نکل گیا ہے تو وہ بہت گھبرائے۔ اب تو بادشاہ کے انتقام سے نجات کی ایک فیصد بھی اُمید نہیں رہی تھی۔ اس لئے انہوں نے طے کیا کہ اپنے اپنے سپاہیوں کو لے کر چنگیز خان کے پاس پناہ لے لیں، ان کا یہ فیصلہ بالکل غلط اور امت مسلمہ کے حق میں سخت تباہ کن تھا مگر انہیں اس وقت اور کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ چنانچہ خوارزمی فوج کے تقریباً ڈیڑھ دو لاکھ سپاہی ان کی قیادت میں راتوں رات چنگیز خان سے جا ملے۔ اس طرح مسلمانوں کی قوت پلک جھپکتے میں پارہ پارہ ہوگئی۔ بدرالدین عمید کی چال کامیاب ہوگئی تھی۔ چنگیز خان نے اس کامیابی پر بے پناہ خوشی ظاہر کی، اب اس کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں رہ گئی تھی۔

خوارزم شاہ اس حادثے کے بعد ایسا گھبرایا کہ اس نے تاتاریوں سے مقابلے کا ارادہ بالکل ترک کر دیا اور ملکوں ملکوں فرار ہوتا ہوا ایک جزیرے میں روپوش ہو گیا۔

بدرالدین عمید کے انجام کے بارے میں کوئی روایت نہیں ملتی۔ تاہم یہی کیا کم تھا کہ چنگیز خان نے اس کا سرسبز و شاداب وطن خزاں رسیدہ پتوں کی طرح روند ڈالا اور اس کے ہم مذہب لاکھوں کلمہ گو مسلمان اس کی نگاہوں کے سامنے موت کے گھاٹ اتر گئے۔ دُنیا میں لوگ ہمیشہ اس کا نام نفرت سے لیتے رہیں گے اور آخرت کی ہلاکت اس کے علاوہ ہے۔

❁❁❁

سیف الدین اغراق

چنگیز خان کے خلاف بھرپور جہاد کرنے والے مجاہد کو دُنیا جلال الدین خوارزم شاہ کے نام سے جانتی ہے۔ انہوں نے افغانستان میں چنگیز خان کی فوج کو تین میدانوں میں شکست فاش دی... ان کے ماتحت افغان اور ترک قبائل کے ایک لاکھ رضا کار جہاد کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ ان قبائل کے ایک سردار کا نام سیف الدین اغراق تھا۔ اس کے پاس 40 ہزار سپاہی تھے، یہ بڑا جنگجو اور ہوشیار انسان تھا مگر اس میں تکبر اور غرور بھی کم نہ تھا۔ اس غرور کی وجہ سے یہ سلطان جلال الدین کی تمام فتوحات کو اپنا کارنامہ سمجھتا تھا، اس کا خیال تھا کہ اگر میں نہ ہوتا تو چنگیز خان کو کوئی شکست نہیں دے سکتا تھا۔ آخر کار اس کی یہ خودسری رنگ لا کر رہی۔

مسلمانوں کو کابل کی لڑائی میں فتح کے بعد مالِ غنیمت میں چنگیز خان کے بیٹے کا قیمتی اور خوبصورت گھوڑا ملا، ابھی مال غنیمت شرعی اصول کے مطابق تقسیم نہیں ہوا تھا کہ سیف الدین اغراق نے اس پر اپنا حق جتانا شروع کر دیا، دوسرے سرداروں نے اسے روکا تو یہ لڑائی پر آمادہ ہو گیا، بات بڑھ گئی، سلطان جلال الدین نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر یہ نہ مانا... جب اسے گھوڑا نہ ملا تو یہ سلطان کے ساتھ غداری کر کے اپنی فوج کے ساتھ پشاور کی طرف نکل گیا، اس کے حامی کئی اور سردار بھی اپنے آدمیوں سمیت اس کے پیچھے چلے گئے۔

سلطان جلال الدین کی فوج اب آدھی سے بھی کم رہ گئی۔ مسلمانوں میں پھوٹ پڑنے سے چنگیز خان کو موقع مل گیا کہ وہ سلطان جلال الدین سے اپنی شکستوں کا بدلہ لے سکے، چنانچہ اس نے بہت بڑی فوج کے ساتھ حملہ کیا اور دریائے سندھ کے کنارے سلطان جلال الدین کو شکست دے کر مسلمانوں کی طاقت کا خاتمہ کر دیا۔

اگر سیف الدین اغراق غداری نہ کرتا تو امید تھی کہ سلطان جلال الدین کی قیادت میں مسلمان تاتاریوں سے بدلہ لے لیتے اور چنگیز خان کے مظالم سے انہیں نجات مل جاتی۔ مگر سیف الدین کی غداری کے نتیجے میں مسلمانوں کی فتح شکست میں بدل گئی اور آئندہ طویل عرصے تک ان پر کفار کی غلامی کی زنجیریں مسلط رہیں۔

سیف الدین اغراق کا انجام یہ ہوا کہ سلطان سے غداری کے کچھ ہی دنوں بعد وہ پشاور کی طرف جاتے ہوئے اپنے ہی دوستوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ سچ ہے غداری کی شاخ پر ہمیشہ کڑوا پھل لگتا ہے۔

ابنِ علقمی

بغداد صدیوں تک عالمِ اسلام کا سیاسی مرکز رہا، عباسی خلفاء نے یہاں چھ صدیوں تک حکومت کی، یہ دُنیا کا سب سے بڑا شہر تھا، خوب آباد و شاداب تھا، کم از کم بیس لاکھ افراد یہاں آباد تھے، دریائے دجلہ اس کے درمیان سے گزرتا تھا۔ اس کے دونوں کناروں پر خوبصورت محلات، پُر رونق بازار اور دلکش باغیچے تھے، مدرسوں اور بلند میناروں والی مساجد میں ہر دم رونق رہتی۔

خلیفہ مستعصم عباسی یہاں کا آخری خلیفہ تھا، وہ ذاتی طور پر نیک آدمی تھا مگر اس کے دور میں بغداد بیرونی خطرات اور اندرونی سازشوں کی زد میں اس طرح آیا کہ وہ حالات پر قابو نہ پاسکا۔ بیرونی خطرہ چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان کا تھا جو عراق کے بڑے حصے پر قبضہ کرنے کے بعد بغداد کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اندرونی خطرہ خلیفہ کا اپنا وزیر اعظم تھا جس کا نام ابنِ علقمی تھا، ملک کا سارا نظام اس کے ہاتھ میں تھا، اصل میں یہ کفار کا ایجنٹ تھا اور عالم اسلام کے اس مرکزِ خلافت کو جڑ سے اکھاڑنا چاہتا تھا۔ اس نے عوام پر ناجائز ٹیکس لگا کر ان کی زندگی دوبھر کر دی تھی۔ یہ بغداد میں فرقہ واریت بھی پھیلا رہا تھا، عوام پر اس نے بڑی زیادتیاں کیں، عوام نے اس پر احتجاج کیا، یہ شکایات خلیفہ کے بیٹے شہزادہ ابوبکر کو پہنچیں، اس نے ابنِ علقمی کی حرکتوں پر کارروائی کی جس سے ابنِ علقمی

جل بھن کر رہ گیا، اس نے بغداد کو فوراً تباہ کرنے کا ارادہ کرلیا۔

اب اس نے ایک طرف تو ہلاکو خان کو خفیہ خط لکھا کہ وہ بغداد پر حملے کی تیاری کرے، دوسری طرف اس نے خلیفہ کو کہا کہ فوج پر خرچہ بہت زیادہ ہو رہا ہے جبکہ ہمارا خزانہ خالی ہے، ہمیں اتنی بڑی فوج کی کوئی ضرورت نہیں، آپ آدھی فوج کو معزول کر دیں۔ خلیفہ نے اس کی باتوں میں آکر ایسا کرنے کی اجازت دے دی، فوج آدھی رہ گئی۔ کچھ عرصے بعد اس نے ترقیاتی کاموں کے لیے فنڈ کی کمی کا بہانہ کر کے فوج میں اور کمی کر دی، اب ہلاکو خان کے لیے راہ صاف تھی، ابنِ علقمی کا اشارہ پا کر اس نے محرم 656ھ میں بغداد پر حملہ کر دیا، اور وہاں خون کے دریا بہا دیے۔ اٹھارہ لاکھ افراد شہید کر دیے گئے، صرف وہی لوگ زندہ بچے جو ابنِ علقمی کے ہم نوا تھے۔

خلیفہ مستعصم عباسی جان بچا کر فرار ہو سکتا تھا مگر ابنِ علقمی نہیں چاہتا تھا کہ خلیفہ بچ جائے۔ وہ تو خلیفہ اور اس کے پورے خاندان کے ساتھ شہر کے تمام علماء کو بھی ختم کرانا چاہتا تھا، اس نے خلیفہ کو دھوکا دیتے ہوئے یہ یقین دلایا کہ میں آپ کو، آپ کے خاندان کو اور شہر کے سارے بڑے علماء کو خود ہلاکو کے پاس لے جاؤں گا، وہ آپ سب سے اچھی طرح پیش آئے گا، خلیفہ نے اس پر یقین کرلیا، وہ اپنے خاندان اور سینکڑوں علماء وفقہاء کے ساتھ ہلاکو خان کے پاس چلا گیا مگر وہاں ان کے استقبال کی بجائے موت ان کی منتظر تھی۔ ان سب کو بڑی بے رحمی سے شہید کر دیا گیا۔

عباسی خلافت کے خاتمے اور بغداد کی تباہی کے بعد ابنِ علقمی کا خیال تھا کہ اس علاقے کی بادشاہت اسے مل جائے گی مگر ہلاکو خان نے اسے کوئی بڑا عہدہ نہ دیا اور ذلیل کر کے رکھا، ابن علقمی کو اس سے ایسا صدمہ ہوا کہ اس کی حالت غیر ہوگئی، جہاں سے گزرتا لوگ

اسے لعنت ملامت کرتے، آخر کار ایک بار ہلاکو خان نے اسے بلایا اور کہا:

''تم اپنے آقا عباسی خلیفہ کے وفادار نہیں رہے تو مجھ سے وفا کیسے کر سکتے ہو۔'' یہ کہہ کر اسے قتل کرا دیا۔ اسی طرح ذلت بھری زندگی کے چند دن گزار کر وہ بہت جلد قبر میں جا پہنچا جہاں بے حد دردناک سزا اس کے لیے تیار تھی۔

اندلس کے غدار

''اے قوت والے بادشاہ! اب ہم آپ کی رعایا بن چکے ہیں۔ یہ شہر، یہ ملک ہم آپ کے حوالے کر رہے ہیں... ہاں!! اللہ کی یہی مرضی تھی... ہمیں یقین ہے کہ... آپ مسلم رعایا کے ساتھ شرافت اور سخاوت کا معاملہ فرمائیں گے...''

درد، رنج اور حسرت میں ڈوبے ہوئے یہ عاجزانہ جملے ابوعبداللہ جیسا غدارِ ملت، فرڈی ننڈ جیسے ظالم و جابر عیسائی حکمران سے کہہ رہا تھا جو غرناطہ پر قابض ہونے کے بعد اب ابو عبداللہ سے شہر کی چابیاں وصول کر رہا تھا۔

ابوعبداللہ کو خود فرڈی ننڈ سے وابستہ امیدوں کی سچائی کا یقین نہیں تھا، اس لئے کہ اس سے پہلے بھی یہ دشمن ہمیشہ اس سے دغا کرتا رہا تھا... مگر اب تو وہ اس کی رعایا تھا... اس کا غلام تھا... اور غلام بدترین آقا سے بھی اچھی امیدوں ہی کا اظہار کیا کرتے ہیں۔

اندلس کی مسلم حکومت کا زوال اسلامی تاریخ کا انتہائی دردناک باب ہے... اس کی آٹھ سو سالہ تاریخ میں کئی اتار چڑھاؤ آئے، اچھے بُرے حکمرانوں، مجاہدوں، وفاداروں اور غداروں کی کئی کھیپیں یہاں وجود میں آئیں اور فنا ہوئیں مگر اس سلطنتِ اسلامیہ کے آخری دور میں کچھ ایسے غدار پیدا ہوئے جنہوں نے اسے مٹا کر ہی چھوڑا۔ ان غداروں اور نااہل افراد میں

اندلس کے آخری حکمران ابوعبداللہ، اس کے چچا الزغل اور اس کے وزیر ابوالقاسم کا کردار زیادہ نمایاں رہا ہے۔

آیئے ذرا اس دور کے حالات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اندلس، اسپین، یورپ کا وہ سرسبز و شاداب، پرفضا اور خوبصورت ملک ہے جہاں مسلمان 800 سال تک بڑی آن بان سے رہے۔ پہلی صدی ہجری کے آخر میں مسلمان جرنیلوں موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد نے اس سرزمین کو فتح کر کے امتِ مسلمہ کی گود میں ڈالا تھا۔ اس کے بعد مسلمان حکمرانوں کے کئی خاندانوں نے نسل در نسل یہاں بڑی شان و شوکت سے حکومت کی۔ مگر کئی صدیوں بعد مسلمان آپس میں خانہ جنگی کا شکار ہو گئے اور عیسائیوں نے ان کے کئی شہروں پر قبضہ کر کے ان کے مقابلے میں اندلس کے اندر ہی ایک مضبوط حکومت قائم کر لی۔ یہ حکومت ''قستالیہ'' کہلاتی تھی جو تیزی سے مسلم علاقوں پر قبضہ کرتی جارہی تھی۔

نویں صدی ہجری کے آخر میں صورتحال یہ تھی کہ مسلمانوں کے پاس صرف ایک بڑا شہر غرناطہ اور اس کے آس پاس کے چھوٹے چھوٹے شہر رہ گئے تھے۔ عیسائی بادشاہ فرڈی ننڈ بڑی عیاری اور مکاری سے مسلمانوں کے علاقے ہتھیا رہا تھا۔ ان دنوں غرناطہ کا حکمران سلطان ابوالحسن نامی ایک عمر رسیدہ شخص تھا، 886ھ، 1481ء میں اس نے یہ دیکھ کر کہ عیسائی بہت جلد پورے اندلس پر قبضہ کرنے والے ہیں، مسلمانوں کے دفاع کے لئے جہاد کا اعلان کر دیا۔

عیسائیوں کی فوج بہت زیادہ تھی مگر سلطان ابوالحسن نے تھوڑی سی فوج کے ساتھ انہیں

مختلف محاذوں پر شکستیں دیں... ہوسکتا تھا کہ فرڈی نںڈ کو مکمل شکست ہوجاتی اور پورے اندلس پر ایک بار پھر اسلام کا پرچم لہرانے لگتا مگر، ایک غدار کی غداری نے سارا بنا بنایا کام بگاڑ دیا۔

یہ غدار خود سلطان ابوالحسن کا بیٹا شہزادہ عبداللہ تھا جب اس نے دیکھا کہ باپ غرناطہ کے باہر جہاد میں مصروف ہے اور دارالحکومت خالی ہے تو اس نے باپ کے تخت پر قبضہ کر کے اپنی حکمرانی کا اعلان کر دیا۔

سلطان ابوالحسن کو اس خبر سے بے حد صدمہ ہوا، اسے جہادی مہمات ترک کر کے واپس غرناطہ آنا پڑا، اس نے غرناطہ کا اقتدار دوبارہ حاصل کرلیا مگر دل ایسا اچاٹ ہوا کہ حکومت اپنے بھائی ''الزغل'' کے حوالے کر دی اور خود بیماری کی حالت میں دُنیا سے رخصت ہو گیا... اس دوران عیسائیوں نے میدان صاف دیکھ کر مسلمانوں کے اور بھی علاقے اپنے قبضے میں لے لیے۔

اس کے ساتھ ساتھ فرڈی نںڈ نے شہزادہ عبداللہ کو یہ پٹی پڑھائی کہ تمہارا چچا ''الزغل'' تمہارے باپ کے تخت پر قابض ہو گیا ہے جو تمہارا حق ہے لہٰذا اس سے غرناطہ چھین لو، ہم غرناطہ پر قبضے میں تمہاری مدد کریں گے۔ نادان ابوعبداللہ نے دشمن کے بہکاوے میں آکر اپنے چچا سے جنگ چھیڑ دی..اب صورت حال یہ تھی کہ تین طرف سے عیسائی مسلمانوں کو گھیرتے جا رہے تھے، چوتھی طرف سمندر تھا اور بیچ میں یہ چچا بھتیجے آپس میں اقتدار کی جنگ لڑ رہے تھے...انجام کار ابوعبداللہ نے 892ھ، 1487ء میں الزغل کو بھگا کر غرناطہ پر قبضہ کرلیا۔

دو سال تک ابوعبداللہ کی فرڈی ننڈ سے دوستی رہی مگر 895ھ، 1490ء میں اسے فرڈی ننڈ کا پیغام ملا کہ غرناطہ بھی عیسائیوں کے حوالے کر دیا جائے۔ اب ابوعبداللہ بڑا گھبرایا، مگر اس کے ساتھ کچھ بہادر جرنیل تھے۔ ان مجاہدوں نے اسے ہمت دلائی تمام بچے کھچے مسلمان عیسائیوں سے مقابلے کے لئے نکل آئے، اللہ کی مدد شامل حال ہوئی، عیسائی شکست کھا کر بھاگ نکلے۔

یہ مسلمانوں کے پاس آخری موقع تھا مگر افسوس اس موقع پر ''الزغل'' غدار کے روپ میں سامنے آگیا... اس نے اپنے بھتیجے سے دشمنی نکالنے کا یہ بہترین موقع سمجھا اور عیسائیوں کی مدد کے لئے پہنچ گیا۔ اس نے فرڈی ننڈ کو ہمت دلائی اور اصرار کیا کہ ابوعبداللہ کا سر فوراً کچل دیا جائے۔ فرڈی ننڈ نے الزغل کو ایک فوج دے کر ابوعبداللہ کے مقابلے پر بھیج دیا۔

جب چچا بھتیجے لڑتے لڑتے بالکل کمزور ہو گئے تو فرڈی ننڈ نے ہر طرف سے عیسائیوں کو جمع کر کے ایک طوفان کی طرح غرناطہ پر حملہ کر دیا، آس پاس کے دیہاتوں میں اس نے مسلمانوں کا اتنا قتل عام کیا کہ ابوعبداللہ کے ہوش اڑ گئے...

چند دن بعد فرڈی ننڈ اندلس کے مسلمانوں کے آخری مورچے غرناطہ کا محاصرہ کر چکا تھا.. غرناطہ کے مسلم حکمرانوں کے عظیم الشان محل ''قصر الحمراء'' کے دالانوں میں عیسائیوں کے نعرے اور ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں کا ہولناک شور صاف سنائی دے رہا تھا۔ عیسائی افواج کی قلعہ شکن توپیں دھنا دھن گرج رہی تھیں جبکہ مسلمان حیرت، خوف اور بے بسی کی تصویر بنے کھڑے تھے۔ محاصرے کو آٹھ ماہ گزر گئے، شہر میں اناج اور خوراک کی کمی سے قحط کی سی صورتحال پیدا ہو گئی۔ ادھر قصر الحمراء میں مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا

تھا عمائد ین سلطنت مشورے کے لئے جمع ہوتے تھے مگر کوئی حل سمجھ نہ آتا۔ ''ابو عبداللہ'' جس کی حماقتوں نے مسلمانوں کو یہ دن دکھایا تھا، اپنے تخت پر اس طرح چپ چاپ بیٹھا رہتا جیسے اس کی قوت فیصلہ جواب دے چکی ہو۔

اسی دوران غرناطہ کے عوام کے چند نمایندے بادشاہ کے دربار میں شہر والوں کی طرف سے یہ پیغام لے کر آئے کہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم اس حال میں بھی دشمن سے ٹکرانے کو تیار ہیں۔ ہم فاقوں سے ویسے بھی موت کے دہانے پر کھڑے ہیں۔ اس بری موت سے بہتر ہے کہ دشمن سے لڑ کر شہادت کی سعادت حاصل کرلیں۔ یہ نوجوان بادشاہ کو سمجھا رہے تھے کہ ہم اب بھی وہی ہیں جو آٹھ سو سال پہلے طارق بن زیاد کے ساتھ چند ہزار کی تعداد میں آئے تھے اور ایک لاکھ عیسائیوں پر غالب آ گئے تھے۔ اب بھی دشمن کی فوج ایک لاکھ ہی ہے۔ ہم اللہ کی مدد پر بھروسہ کرتے ہوئے اس سے بھڑ جائیں تو کوئی بعید نہیں کہ ہمیں فتح حاصل ہو۔

بادشاہ کے غیور سپہ سالار موسیٰ بن ابیل غسانی نے بھی شہر کے عوام کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے پرزور الفاظ میں کہا کہ ہمیں آخر دم تک مقابلہ کرنا چاہیے، مگر... ابو عبداللہ پر مایوسی اور شکست خوردگی اس طرح چھا چکی تھی کہ وہ لڑائی کی اجازت دینے کی ہمت نہ کرسکا... اس نے فقط اتنا کہا:

''عیسائی غرناطہ فتح کیے بغیر نہیں لوٹیں گے''۔ بزدل اور کم ہمت ابو عبداللہ اب غرناطہ کو عیسائیوں کے حوالے کردینے پر ہی غور کر رہا تھا۔ اس کا خوشامدی اور ڈرپوک وزیر ابوالقاسم اسے مسلسل یہی ترغیب دے رہا تھا کہ غرناطہ عیسائیوں کے حوالے کر کے ہی ہماری جان بچ سکتی ہے۔

آخر کار ابو عبداللہ نے ہتھیار ڈال دینے کا فیصلہ کرلیا مگر اسے ڈر تھا کہ کہیں اس فیصلے کی

بھنک عوام کو پڑ گئی تو وہ بغاوت کر دیں گے اور سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر عیسائیوں سے جنگ شروع کریں گے۔

چنانچہ اس نے اپنے وزیر ابوالقاسم سے مشورہ کیا۔ ملت کے ان دو بڑے غداروں نے مل کر یہ طے کیا کہ عیسائی بادشاہ ''فرڈی ننڈ'' سے خفیہ طور پر یہ معاہدہ کرلیا جائے کہ شہر ان کے حوالے کر دیا جائے گا بشرطیکہ وہ مسلمانوں کے جان و مال، مذہب، اسلامی شعائر اور عبادت گاہوں کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔

یکم ربیع الاول 897ھ، 3 جنوری 1492ء کو ابوالقاسم خفیہ طور پر شہر سے نکل کر فرڈی ننڈ سے ملا اور دونوں نے غرناطہ کو عیسائیوں کے حوالے کرنے کے معاہدے پر دستخط کر دیے۔ طے یہ ہوا کہ ساٹھ دن بعد اس معاہدے پر عمل ہوگا۔

اِدھر شہر کے پر جوش نوجوانوں کو حکومت اور عیسائیوں کے گٹھ جوڑ کی سن گن مل گئی تھی۔ اس سے پورے شہر میں اشتعال پھیل گیا، عوام فاقوں سے مرنے کے باوجود عیسائیوں کی غلامی پر تیار نہ تھے، وہ جگہ جگہ ہنگامے کرنے لگے۔ یہ دیکھ کر ابوعبداللہ نے ساٹھ دن گزرنے کا انتظار بھی نہ کیا اور صرف گیارہ دن بعد شہر کے دروازے عیسائی افواج کے لئے کھلوا دیے۔

12 ربیع الاول 897ھ۔14 جنوری 1492ء کی صبح عالم اسلام کے لیے انتہائی حسرت ناک تھی، اس دن عیسائی بادشاہ فرڈی ننڈ پوری شان وشوکت سے غرناطہ میں داخل ہو رہا تھا، قصر الحمراء کو اپنے سامنے دیکھ کر عیسائی حکمران اور اس کی ملکہ خوشی سے جھوم رہے تھے۔ پورے اسپین پر عیسائیوں کے قبضے کا آٹھ سو سالہ دیرینہ خواب آج پورا ہو رہا تھا... قصر الحمراء سے اسلامی سلطنت کا پرچم اتار کر صلیب نصب کی جانے لگی تو مسلمانوں کی چیخیں نکل گئیں۔ غرناطہ کے مسلمان آنسوؤں اور آہوں کے ساتھ اپنی گردنوں میں غلامی کی نہ ٹوٹنے

والی زنجیر کے حلقے دیکھ رہے تھے...ان کے دلوں سے ابوعبداللہ، ابوالقاسم اور الزغل جیسے غداروں کے لئے بددعائیں نکل رہی تھیں جنہوں نے ایک آباد و شاداب اسلامی مملکت کو اتنی آسانی سے طشت میں سجا کر دشمنوں کے حوالے کر دیا تھا۔

✡

ابوعبداللہ غرناطہ سے نکلتے ہوئے رو رہا تھا، اس کی ماں نے یہ دیکھ کر کہا: ''بیٹا! تو جس ملک کی مردوں کی طرح حفاظت نہ کر سکا، اس سے محرومی پر عورتوں کی طرح آنسو بہانے کا کیا فائدہ۔''

ابوعبداللہ اور الزغل کو جلاوطن کر کے افریقہ کے ملک مراکش بھیج دیا گیا، جہاں وہ گمنامی کی موت مر گئے۔ پیچھے عیسائیوں نے معاہدے کی دھجیاں اڑاتے ہوئے پورے اندلس میں مسلمانوں کا ایسا ہولناک قتل عام کیا کہ آٹھ سو سال سے یہاں آباد بے شمار مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹ گیا، یہ ملک اللہ پر ایمان رکھنے والوں سے بالکل خالی ہو گیا۔

آج بھی اندلس میں غرناطہ کا قصرِ الحمراء اور قرطبہ کی جامع مسجد ابوعبداللہ اور الزغل اور ابوالقاسم جیسے غداروں کے کرتوتوں پر فریاد کرتے محسوس ہوتے ہیں...اگر یہ غیروں کی پالیسیوں پر عمل کرنے کی بجائے متحد ہو کر دشمنوں کا مقابلہ کرتے تو آج اندلس کی تاریخ مختلف ہوتی مگر افسوس غیروں کے ہاتھوں میں کھیلنے والے ایسے غدار ہمیشہ آستین کے سانپ بن کر امت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچاتے رہے۔

میر جعفر

اٹھارھویں صدی عیسوی برصغیر میں مسلمانوں کے زوال کا آغاز تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر رحمہ اللہ کی وفات کے بعد مغل سلطنت روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ برصغیر کے ساحلوں پر انگریزوں نے تجارتی بستیاں قائم کر لی تھیں جن کی آڑ میں وہ اپنی فوجی طاقت بڑھا رہے تھے اور پورے ہندوستان پر قبضے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ہندوستان کے امراء، صوبے دار، نواب اور ہندو راجے آپس کے اختلافات میں الجھے ہوئے تھے اور انگریز کے خلاف کچھ کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ مغل حکومت کے صوبے دار ایک ایک کر کے مرکز سے آزاد ہوتے جا رہے تھے۔ 1741ء میں بنگال اور بہار پر ایک دلیر حاکم علی وردی خان نے آزاد حکومت قائم کر لی۔ وہ برصغیر کا واحد حکمران تھا جو انگریزوں کے عزائم سے پوری طرح آگاہ تھا۔ اس نے انگریزوں پر یہ پابندی عائد کر دی تھی کہ وہ تجارتی بستیوں میں قلعے اور فوجی چوکیاں تعمیر نہیں کریں گے۔

علی وردی خان کی وفات کے بعد اس کے نوجوان نواسے نواب سراج الدولہ نے حکومت سنبھالی۔ انگریزوں نے نواب علی وردی خان سے کیے گئے وعدے کے خلاف قلعے تعمیر کرنا شروع کر دیے تھے، ان کے عزائم پورے بنگال پر قبضے کے تھے۔ نواب سراج الدولہ ایک بہادر مسلمان تھا۔ اس نے انگریزوں کی عہد شکنی پر انھیں تنبیہہ کی لیکن جب وہ

باز نہ آئے تو نواب سراج الدولہ نے ان کے خلاف جہاد کا آغاز کر دیا۔نواب سراج الدولہ نے کلکتے پر حملہ کیا جو کہ انگریزوں کا مضبوط مرکز تھا اور انگریزوں کو عبرت ناک شکست دے کر کلکتہ سے نکال باہر کیا۔

انگریز اپنی اس شکست سے بڑے رسوا ہوئے، وہ نواب سے بدلہ لینے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔ بدقسمتی سے برصغیر کی سرزمین غداروں کے لیے بڑی زرخیز ثابت ہوئی ہے، یہاں قدم قدم پر آستین کے سانپوں سے پالا پڑتا ہے۔نواب سراج الدولہ کی آستین میں بھی ایسا ہی ایک سانپ پل رہا تھا۔اور وہ تھا، بنگال کا وزیر اعظم میر جعفر۔

میر جعفر کو سراج الدولہ کے دربار میں جو اعزاز حاصل تھا، اس سے اس کا حوصلہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ بنگال کا نواب بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔اس نے انگریزوں سے مل کر ایک سازش کی، طے یہ ہوا کہ آیندہ فیصلہ کن جنگ میں میر جعفر جنگ کے دوران فوج لے کر نواب سراج الدولہ سے الگ ہو جائے گا اور سراج الدولہ کی شکست کے بعد انگریز میر جعفر کو بنگال کا نواب بنا دیں گے۔سراج الدولہ کے دربار کے کئی ہندو افسران اور کلکتہ کے ہندو سیٹھ بھی اس سازش میں انگریزوں کے ساتھ تھے۔

اب ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ کلایو نے ''مدراس'' سے امدادی فوجیں اکٹھی کر کے ایک بڑا لشکر تیار کیا اور سراج الدولہ سے لڑنے کے لیے بھرپور تیاری کر لی۔

اِدھر بنگال میں سراج الدولہ کی دعوتِ جہاد پر بچہ بچہ انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لیے تیار تھا، ہر طرف ''انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دو'' کے نعرے لگ رہے تھے۔قوم کی ماؤں، بہنوں، بچوں اور بوڑھوں، سب کی دعائیں نواب سراج الدولہ کے ساتھ تھیں۔

نواب سراج الدولہ اپنے وفادار سالار میر مدن کے ساتھ بنگال کے پایہ تخت مرشد آباد

سے روانہ ہوئے تو پوری قوم ان کی فتح کی دعائیں کر رہی تھی، سب کو یقین تھا کہ انگریزوں کو بہت جلد سات سمندر پار واپس جانا پڑے گا مگر کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ نواب سراج الدولہ کی فوج کی کمان جس شخص کے ہاتھ میں ہے، وہ انگریزوں سے مل چکا ہے۔ لارڈ کلایو اور میر جعفر کی سازش تیار ہو چکی تھی۔

جون کا مہینہ تھا، سخت گرمی پڑ رہی تھی، پلاسی کے مقام پر دریا کے ایک موڑ کے ساتھ نواب کی افواج نے پڑاؤ ڈالا۔ انگریزی فوج دریا پار کر کے اِدھر آچکی تھی اور دریا کی طرف پشت کیے صف باندھے ہوئی تھی۔ نواب سراج الدولہ کے دائیں بازو پر بہادر سالار میر مدن تھا۔ جب کہ بائیں جانب آستین کا سانپ میر جعفر زیرِلب مسکرا رہا تھا۔ ہندو امراء کے دستے بھی انگریزوں کی طرف دوستانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ نواب سراج الدولہ کو اپنی افواج کی وفاداری پر بھروسہ تھا مگر جنگ شروع ہوتے ہی حقیقت سامنے آگئی۔ میر جعفر اور ہندو امراء جنگ میں شریک نہ ہوئے۔ ان کے ماتحت ہزاروں سپاہی ایک طرف کھڑے تماشا دیکھتے رہے۔ صرف سراج الدولہ اور میر مدن اپنے چند دستوں کے ساتھ انگریزوں سے لڑتے رہے۔ انگریزی توپ خانہ گرج گرج کران کے پرخچے اڑاتا رہا، جب کہ بنگالی افواج کا توپ خانہ میر جعفر کے اشارے پر بالکل خاموش تھا۔ پلاسی کے میدان میں بنگال کے مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ ابتدائی لمحات ہی میں ہوگیا۔ میر مدن نہایت دلیری سے لڑتے ہوئے اپنے جانثار سپاہیوں سمیت شہید ہوگیا۔ سراج الدولہ کو گرفتار کر کے ایک جگہ قید کر دیا گیا اور پھر انگریز افسران نے اس مردِ مجاہد کو شہید کر دیا۔

1757ء کی جنگ پلاسی ہندوستان میں انگریزوں کی سب سے پہلی بڑی فتح تھی اس کے نتیجے میں پورا بنگال، بہار اور اڑیسہ ان کے قبضے میں آگیا۔ انگریزوں نے فتح کے بعد میر

جعفر کو حسبِ وعدہ بنگال کا نواب تو بنا دیا مگر درحقیقت وہ برائے نام حکمران تھا۔ سارا اختیار انگریزوں ہی کے پاس تھا۔ وہ میر جعفر کی آڑ میں بنگال کے مسلمانوں کا خون چوسنے لگے، بنگال کے خزانے کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ لوٹ کر انھوں نے چند ہی مہینوں میں خالی کر دیا۔ میر جعفر اس صورتِ حال سے تنگ آ گیا، عوام کے افلاس اور فاقوں سے بنگال ایک قحط زدہ دیہات دکھائی دینے لگا، ان کے احتجاج سے میر جعفر کی زندگی اجیرن ہوگئی۔ اس نے انگریزوں سے لوٹ کھسوٹ میں کمی کی درخواست کی تو 1773ء میں انگریزوں نے اسے ''نااہل'' قرار دے کر میر قاسم نامی ایک شخص کو بنگال کا کٹھ پتلی حاکم بنا دیا مگر میر قاسم میں ملک وقوم سے وفاداری کے اثرات دیکھ کر انگریزوں نے کچھ مدت بعد دوبارہ میر جعفر کو حکمران بنا دیا۔

میر جعفر کی زندگی کا ہر دن اس کے لیے موت سے کم نہیں تھا، اسے روزانہ انگریزوں سے بھی درجنوں دھمکیاں اور مطالبات سننے پڑتے اور عوام کی بے حساب گالیاں، بد دعائیں اور لعنتیں بھی اس پر برس رہی تھیں۔ 1775ء میں میر جعفر ملک وقوم سے غداری کی کالک منہ پر ملے ہوئے قبر کی تنگ و تاریک کوٹھری میں جا پہنچا۔ وہ قبر جو اسلام کے وفاداروں کے لیے جنت کا باغ بن جاتی ہے اور غداروں کے لیے جہنم کا گڑھا۔

میسور کے غدار

ویسے تو آستین کے سانپ ملت اسلامیہ کی ہر سلطنت میں پھنکارتے اور زہر پھیلاتے نظر آتے ہیں مگر جس کثرت سے انھوں نے میسور کی 'سلطنتِ خداداد' میں اپنے بل بنا رکھے تھے، اس کی مثال شاید ہی تاریخ میں کہیں اور ملے۔

اٹھارھویں صدی کے وسط میں جنوبی ہندوستان کی ریاست میسور سخت سیاسی بحران کا شکار تھی۔ ان حالات میں ایک ہوشیار اور جرأت مند فوجی افسر حیدرعلی نے وہاں کے تخت پر قبضہ کر کے ایک آزاد حکومت قائم کی اور اسے مزید وسیع کر دیا۔ بنگال میں نواب سراج الدولہ کی شکست کے بعد نواب حیدرعلی انگریزوں کے ناپاک ارادوں کو خوب سمجھ چکے تھے۔ انہوں نے اپنی عسکری قوت کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کیا، اپنی ریاست کے عوام کو خوب خوشحال کیا اور ان میں انگریزوں سے لڑنے کا جذبہ پیدا کیا۔

حیدرعلی کی گھڑسوار فوج جسے ''رسالہ'' کہا جاتا تھا، برصغیر کی سب سے تیز رفتار فوج تھی۔ نواب حیدرعلی نے انگریزوں سے کئی جنگیں لڑیں اور ہمیشہ انھیں شکست دی... انگریز ہر بار شکست کے بعد صلح کر لیتے مگر صلح ناموں کی شرائط کی ہمیشہ خلاف ورزیاں کرتے۔ وہ حیدرعلی کو اپنے لیے سب سے بڑا خطرہ سمجھتے تھے اس لیے ہر بار نئی تیاری کے ساتھ ان کے خلاف جنگی منصوبے بنانے لگتے۔ نواب حیدرعلی کینسر کی بیماری میں مبتلا تھے، پھر بھی انہوں

نے آرام نہ کیا۔ وہ انگریزوں کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاریوں میں مصروف رہے۔ انگریزوں نے ''صلح نامہ مدراس'' کی شرائط پوری نہ کیں تو حیدر علی نے ایک بار پھر فوجیں تیار کر کے انگریزوں کے قلعوں کی طرف پیش قدمی کی۔ انگریزوں کو پتا چلا کہ حیدر علی کی فوج ''مدراس'' سے صرف نوے میل کے فاصلے پر آ چکی ہے۔ وہ گھبرا گئے، جنرل منرو اور جنرل بیلی دو الگ الگ فوجیں لے کر حیدر علی کے مقابلے پر آئے، جنرل بیلی کی فوج کو حیدر علی کے نوجوان بیٹے ''فتح علی ٹیپو'' نے شکست فاش دی۔ جب کہ جنرل منرو کی فوج ڈر کر لڑے بغیر پسپا ہو گئی۔

اس موقعے پر حیدر علی کا مرض بہت بڑھ گیا تھا مگر وہ میدان جنگ سے واپس نہ گئے اور آخر کینسر کا پھوڑا پھٹ جانے کے سبب وہیں شہید ہو گئے۔

نواب حیدر علی کے بعد ان کے بیٹے فتح علی ٹیپو نے سلطنت سنبھالی۔ فتح علی ٹیپو، ٹیپو سلطان کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ٹیپو سلطان نے جب حکومت سنبھالی تو اس وقت انگریزوں سے جنگ جاری تھی، سلطان نے میدانِ جنگ ہی میں بادشاہت کا منصب سنبھالا اور بڑی ہمت سے انگریزوں کا مقابلہ کرتے ہوئے انہیں شکست فاش دی۔ جنگ سے فارغ ہو کر وہ دارالحکومت سرنگاپٹم واپس آئے اور وہاں تخت نشینی کی رسم ادا ہوئی۔ ٹیپو سلطان نہایت دلیر، ذہین اور غیر معمولی سمجھ بوجھ والے انسان تھے۔ علومِ دینیہ اور سائنس و ٹیکنالوجی کے ماہر تھے، ان کے دور میں میسور کا نام 'سلطنتِ خداداد' رکھا گیا۔ یہ سلطنت ہندوستان کا سب سے خوشحال حصہ بن گئی۔ انگریز یہ کہاں برداشت کر سکتے تھے، انھوں نے ٹیپو سلطان کے خلاف جنگ کی تیاریاں کیں۔ جنرل میڈوز ایک بڑا لشکر لے کر سلطان کے مقابلے پر آیا مگر سلطان نے اسے بری طرح شکست دی۔

کئی سال تک سلطان اور انگریزوں کی جنگیں جاری رہیں۔ کچھ عرصے بعد لارڈ کارنوالس گورنر جنرل بن کر ہندوستان آیا۔ وہ بڑا شاطر انسان تھا۔ اس نے جان لیا کہ طاقت کے بل پر سلطان کو شکست دینا ناممکن ہے۔ اس نے میسور کی ہمسایہ سلطنتوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ حیدر آباد دکن کا مسلمان حکمران نظام بھی اس کے ساتھ مل گیا۔ ارکاٹ کا نواب محمد علی والا جاہ بھی انگریزوں کی صف میں کھڑا ہو گیا۔ ہندو مرہٹے تو پہلے ہی انگریزوں کے طرف دار تھے۔ ان چاروں طاقتوں نے مل کر چاروں طرف سے میسور پر یلغار کر دی۔ ٹیپو سلطان پہلے کھلے میدان میں ان سے مقابلہ کرتے رہے مگر آخر میں انہیں پسپا ہو کر میسور کے دارالحکومت سرنگا پٹم کے قلعے میں محصور ہونا پڑا، ایک سال تک وہ اسی حالت میں لڑتے رہے، اگرچہ میسور کے بہت سے قلعے انگریزوں کے قبضے میں آ گئے مگر انگریزوں کی فوج بہت تھک چکی تھی، ان کے اتحادی بھی واپس جانے کے لیے بے چین تھے۔ لارڈ کارنوالس کو خطرہ تھا کہ کچھ دن بعد اتحادی واپس چلے گئے تو حالات کا پانسا سلطان کے حق میں پلٹ جائے گا۔ اس نے کوشش کی کہ اپنی کمزوری ظاہر کیے بغیر سلطان کو جلد از جلد سخت شرائط کے تحت صلح پر آمادہ کر لے۔ ٹیپو سلطان کی ہمت اب بھی جوان تھی، وہ اس حال میں بھی دیر تک انگریزوں سے لڑ سکتے تھے مگر اب آستین کے ان سانپوں نے اپنا زہر پھیلانا شروع کر دیا تھا جو سلطنت میسور کے ایوانوں میں موجود تھے۔

غداروں کی ایک پوری جماعت سلطان کے دربار میں پل رہی تھی۔ ان میں سے چند غداروں کے نام درج ذیل ہیں: وزیر خزانہ پورنیا (ہندو)، سپہ سالار اعظم میر معین الدین، سالار میر قمر الدین، ٹرمل راؤ (ہندو)، کرشنا راؤ (ہندو)، ماہر امور سیاسیات و سفارت میر غلام علی لنگڑا، میر عالم، مہدی علی خان۔ مگر سلطنت کے ان بڑے بڑے غداروں میں سب

سے بڑا سازشی وزیرِ اعظم میر صادق تھا۔ اس کے ہاتھ میں پورا نظامِ حکومت تھا۔ ان غداروں نے انگریزوں سے مل کر سلطان کے خلاف سازش تیار کی، سلطان کو نہایت سخت شرائط پر انگریزوں سے صلح پر مجبور کرنے کی کوشش کی، میسور کی حکومت پر ناقابلِ برداشت حد تک تاوانِ جنگ کی رقم ڈال دی گئی، آدھی سلطنت انگریزوں کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا گیا اور سلطان کے دو بیٹوں کو ضمانت کے طور پر تاوان کی رقم ادا ہونے تک انگریزوں کی قید میں رکھنے کی شرط بھی عائد کی گئی۔ اس کے ساتھ ہی انگریزوں نے دیہاتوں میں مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ عوام ان شرائط کے خلاف تھے مگر میر صادق اور دیگر غدار امراء نے سلطان پر مزید دباؤ ڈالا اور صلح نامے پر دستخط کرنے کے لیے یہ کہا کہ اگر آپ نے تاخیر کی تو انگریز دیہاتوں اور بستیوں میں کسی مسلمان کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ عوام کی جانیں بچانے کے لیے مجبوراً سلطان نے شرائط مان لیں۔ آدھا میسور ان کے ہاتھ سے نکل گیا، خزانہ خالی ہو گیا، سلطان کے دو بیٹے انگریز کی قید میں چلے گئے۔

سلطان نے ہمت نہ ہاری اور بچے کھچے ملک میں اپنی معاشی اور فوجی قوت کو دوبارہ پروان چڑھانا شروع کیا، چند برسوں میں ملک دوبارہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا۔ انہی دنوں نیا انگریز گورنر جنرل "ویلزلی" ہندوستان آیا۔ یہ بڑا بے رحم اور سفاک انسان تھا، اس نے صلح نامے کی پروا نہ کرتے ہوئے سلطان پر فرانس کے حکمران نپولین بونا پارٹ سے انگریزوں کے خلاف ساز باز کا الزام لگایا اور میسور پر حملہ کر دیا۔

اس بار اندرونی غدار کھل کر انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ یہ 1799ء کا واقعہ ہے۔ انگریزی فوجیں سرنگاپٹم کے بالکل قریب پہنچ گئی تھیں مگر غداروں نے سلطان کو اس کا علم ہی نہ ہونے دیا۔ فوج کے غدار افسران نے انگریزی افواج کو سرحدیں عبور کرتے

ہوئے بالکل نہ روکا۔ میر صادق نے انگریز گورنر جنرل سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ فتح کے بعد سلطنتِ میسور کا تاج اس کے سر پر رکھا جائے گا۔

جب سلطان ٹیپو سرنگا پٹم کے قلعے میں گھر گئے اور انھیں کہیں سے کوئی مدد نہ پہنچی تو وہ سمجھ گئے کہ اب آخری معرکہ یہیں ہوگا۔ وہ غداروں کو اچھی طرح جانتے تھے مگر کیا کرتے، اس لیے کہ یہاں تو ہر دوسرا شخص غدار دکھائی دے رہا تھا۔

سرنگا پٹم کے قلعے اور انگریز فوج کے درمیان دریا کاویری حائل تھا، انگریز اب تک دور سے گولہ باری کر رہے تھے۔ ان میں اب بھی قلعے کے قریب آنے کی ہمت نہیں تھی۔ آخر غداروں نے انھیں قلعے کی دیوار کے کمزور حصوں کا پتا بتا دیا۔ انگریزی توپ خانے نے ان حصوں پر مسلسل گولہ باری کر کے فصیل میں شگاف ڈال دیے۔ 2 مئی 1799ء کو انگریزی فوجیں قلعے کے اندر داخل ہو گئیں۔ سلطان ٹیپو اپنے جاں نثار سپاہیوں کے ساتھ قلعے میں داخل ہونے والے دشمنوں پر پل پڑے۔ گھمسان کی جنگ کے بعد آخر کار سلطان شہید ہو گئے۔ ان کی لاش رات کی تاریکی میں مجاہدین کی لاشوں کے نیچے دبی ہوئی ملی۔ ٹیپو سلطان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ہیبت اتنی تھی کہ انگریز قریب جاتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ان کا خوف دور ہوا اور انہیں یقین ہو گیا کہ سلطان شہید ہو چکا ہے تو وہ لاش کے قریب آئے، اس موقع پر ایک انگریز افسر نے ان کی لاش پر کھڑے ہو کر نعرہ لگایا:

''اب ہندوستان ہمارا ہے'' اور واقعی ایسا ہوا۔ پھر انگریزوں کو دہلی تک کوئی نہ روک سکا، انگریزوں نے میسور کو جی بھر کر لوٹا مگر غداروں کو کچھ بھی نہ ملا، ان غداروں کا انجام بہت برا ہوا۔

بہت سوں کو تو ٹیپو کے وفادار سپاہیوں یا عوام نے اسی دن مار ڈالا۔ اور جو بچ گئے انھیں

انگریزوں نے بری طرح دھتکار دیا۔ میر صادق کو سلطان کی شہادت کے فوراً بعد ایک مجاہد نے واصل جہنم کر دیا۔ اس کی لاش کو انگریزوں نے ایک گڑھے میں پھینک دیا۔ میر معین الدین بھی اسی دن ایک مجاہد کے ہاتھوں مارا گیا۔ میر قمر الدین کچھ عرصے بعد جذام کی بیماری میں گل سڑ کر مر گیا، غلام علی لنگڑا کئی سال زندہ رہا مگر اتنا ذلیل و رسوا تھا کہ جو مسلمان بھی اسے کہیں سے گزرتا ہوا دیکھتا، اس پر نفرت سے ضرور تھوکتا تھا۔ میر عالم کا یہ حال ہوا کہ زہریلی بیماری نے اس کا جسم گلا دیا، اسے علاج کے لیے سانپوں سے ڈسوایا جاتا تو سانپ اس کے زہر سے خود مر جاتے۔ ایک عرصے تک یہ زہر سے تڑپتا رہا اور بہت بری موت مرا۔ میسور کی حکومت پر سابق ہندو راجاؤں کے خاندان کے کسی فرد کو برائے نام اختیارات دے کر بٹھا دیا گیا۔ آستین کے سانپ تو اپنی موت آپ مر گئے مگر ہندوستان کی آزادی کی وہ مشعل جسے ٹیپو سلطان نے اپنے لہو سے روشن کیا تھا، آج تک مجاہدین کو راہ دکھا رہی ہے۔

مہدی علی خان

میسور کی تیسری جنگ کے بعد ٹیپو سلطان کی طاقت بہت کم ہو چکی تھی، ہندوستان کے سارے نواب اور راجے ان کے دشمن ہو چکے تھے۔ سب انگریزوں کے ساتھ مل گئے تھے... سلطان کی مدد کے لیے کوئی تیار نہ تھا، انگریز میسور پر آخری فیصلہ کن حملے کے لیے تیار تھے، ایسی حالت میں سلطان کو افغانستان کے پہاڑوں میں امید کی ایک کرن چمکتی دکھائی دی... افغانستان کے غیور مسلمان ہمیشہ ہندوستان کے مسلمانوں کے مددگار رہے تھے۔ ان دنوں وہاں احمد شاہ ابدالی کے پوتے زمان شاہ کی حکومت تھی۔ زمان شاہ ایک دلیر مرد مجاہد تھا... ٹیپو سلطان نے ہر طرف سے ناامید ہو کر اسے آخری سہارا سمجھتے ہوئے سید حبیب اللہ کے ہاتھ یہ خط بھجوایا:

''ہم مسلم حکمرانوں کے مابین دین کے نام پر اتحاد کے خواہش مند ہیں، اس وقت اسلام دشمن طاقتیں ہم پر حملے کی تیاریاں کر رہی ہیں، ہم آپ سے مدد طلب کرتے ہیں، امید ہے کہ آپ اس نیک کام میں ہمارے ساتھ شامل ہوں گے۔ والسلام۔ فتح علی ٹیپو۔''

چند ہفتوں بعد سلطان کو افغانستان کے بادشاہ کا یہ جوابی خط موصول ہوا:

''آپ کا خط اور تحائف ملے، محبت میں تازگی آئی۔ ہم اللہ کی مدد سے ایک بڑا لشکر لے کر آرہے ہیں، کیونکہ اسلام کے دشمن ایک اسلامی سلطنت کو ختم کرنے پر تلے ہوئے

ہیں... ہم اس ملک کو کفر و بدعت سے پاک کر دیں گے۔ والسلام......زمان شاہ۔''

زمان شاہ جہاد میں ٹیپو سلطان کا ساتھ دینے کے لیے 33 ہزار افغان مجاہدین کا لشکر لے کر کابل سے چل پڑا... انگریزوں کو اس کی خبر ہوئی تو ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، انھیں یقین ہو گیا کہ اب ٹیپو سلطان اور زمان شاہ مل کر ان کا نام و نشان تک مٹا دیں گے...

ادھر ٹیپو سلطان اس غیبی مدد کے شدت سے منتظر تھے، ان کا ہر لمحہ افغان مجاہدین کے انتظار میں گزر رہا تھا... وہ چاہتے تھے کہ مجاہدین جلد از جلد میسور پہنچیں اور وہ ان کے ساتھ مل کر انگریزوں کو کبھی نہ بھولنے والا سبق دیں۔

دن گزرتے گئے... زمان شاہ کا لشکر پنجاب تک آ چکا تھا، سلطان کو امید تھی کہ چند ہفتوں میں وہ میسور پہنچ جائے گا کہ ایک دن اچانک سلطان ٹیپو کو اطلاع ملی کہ زمان شاہ کی پیش قدمی رُک گئی ہے، پھر اطلاع ملی کہ وہ اپنے لشکر سمیت واپس افغانستان جانے پر مجبور ہو گیا ہے۔

زمان شاہ کو ہندوستان تک پہنچ کر اچانک کیوں واپس جانا پڑا... اس کا ذمہ دار سلطان ٹیپو کا ایک سابق وزیر مہدی علی خان تھا...

مہدی علی خان آستین کا سانپ بن کر تیسری جنگِ میسور تک ٹیپو سلطان کو ڈستا رہا... آخر کار سلطان نے تنگ آ کر اسے اپنی سلطنت سے نکال دیا... کاش کہ اسے قتل کر دیا جاتا تو بہت بہتر ہوتا... مگر سلطان کی رحم دلی آڑے آئی اور یوں اس کی جان بچ گئی۔

یہ غدار سلطان کے ہاں سے نکالے جانے کے بعد انگریزوں کے پاس ملازم ہو گیا... انگریزوں نے اسے ایران میں اپنا ریزیڈنٹ مقرر کر دیا... کچھ عرصے بعد جب انگریزوں کو پتا چلا کہ زمان شاہ ٹیپو سلطان کی مدد کے لیے آ رہا ہے تو انگریزوں نے مہدی علی خان کو فورا

پیغام بھجوایا کہ کسی طرح ایران کے بادشاہ کو افغانستان پر حملہ کرنے کے لیے اکساؤ... مہدی علی خان کو ایران کے بادشاہ کے دربار میں خاصا اثر و رسوخ حاصل ہو گیا تھا... اس نے جھوٹے پروپیگنڈے کی بنیاد پر شاہ ایران کو یقین دلایا کہ افغانستان کا حکمران زمان شاہ ایران کا پکا دشمن ہے، وہ ایران کو تباہ کر دینا چاہتا ہے۔ مہدی علی خان نے شاہِ ایران کو مشورہ دیا کہ وہ شاہ زمان کی افغانستان میں غیر موجودگی سے فائدہ اٹھائے اور افغانستان پر قبضہ کر لے... اس معاملے میں انگریز بھی آپ کے ساتھ ہیں...

شاہ ایران اس جھانسے میں آ گیا۔ اس نے افغانستان کے صوبے خراسان پر حملہ کر دیا۔

شاہ زمان اس وقت کابل سے سینکڑوں میل دور تھا اور تیزی سے میسور کے قریب ہوتا جا رہا تھا... اسے جب خبر ملی کہ ایران افغانستان پر حملہ کر چکا ہے تو وہ ہکا بکا رہ گیا... اسے مجبوراً اپنا ملک بچانے کے لیے واپس جانا پڑا... اس کا ارادہ تھا کہ ایران سے نپٹنے کے بعد دوبارہ ٹیپو سلطان کی مدد کو آؤں گا مگر اس کے بعد انگریزوں نے ٹیپو سلطان کو دوبارہ مہلت نہ دی اور یوں میسور کی چوتھی جنگ میں سلطنت خداداد کا چراغ بجھ گیا... انگریزوں کے نزدیک مہدی علی خان کا یہ سیاہ کارنامہ اتنا بڑا تھا کہ اسے انعام کے طور پر دو لاکھ اسی ہزار روپے دیے گئے۔ یہ اتنی بڑی رقم تھی کہ وہ عمر بھر عیش کرتا رہتا مگر کب تک... موت کا بے رحم پنجہ ایک دن اس کے حلق کو دبوچ کر رہا... آج بھی وہ منوں مٹی تلے اپنے اعمال بد کا خمیازہ بھگت رہا ہے... دُنیا آج بھی اسے آستین کا سانپ کہتی ہے... اس کی آل اولاد اس کا نام لیتے ہوئے شرماتی ہے۔

شیر اور گیدڑ

راجہ خان ٹیپو سلطان کا ذاتی خدمت گار تھا، میسور کی چوتھی جنگ میں یہ آخری لمحات تک سلطان کے ساتھ تھا مگر افسوس کہ یہ کم بخت بھی انگریزوں کا وفادار تھا۔ انگریزوں نے اسے حکم دیا تھا کہ سلطان کو زندہ گرفتار کرانے کی کوشش کرے.... اسی لیے راجہ خان سلطان کے ساتھ ساتھ رہا۔ سلطان کو اس وقت چاروں طرف سے انگریزوں نے گھیرا ہوا تھا، انھیں کئی گولیاں لگ چکی تھیں، جسم زخمی تھا۔ خون بہ رہا تھا، وہ شیر کی طرح لڑ رہے تھے۔ یہ مئی کا مہینا تھا، شدت کی دھوپ پڑ رہی تھی، صبح سے لڑتے لڑتے سلطان کا پیاس سے برا حال ہو چکا تھا۔ وہ بار بار راجہ خان سے کہہ رہے تھے:

''راجہ خان! پانی دو۔''

سلطان کی پانی کی چھاگل راجہ خان ہی کے پاس تھی مگر راجہ چاہتا تھا کہ سلطان بے دم ہو کر گر پڑیں اور وہ انھیں گرفتار کر کے انگریزوں سے انعام حاصل کرے۔ اس لیے اس ظالم نے سلطان کے زخمی جسم اور پیاس سے خشک ہونٹوں پر ذرا بھی رحم نہ کیا۔ پانی پاس ہوتے ہوئے بھی اس نے سلطان کو ایک گھونٹ پانی نہ دیا بلکہ بار بار جواب میں یہ کہتا رہا:

''حضور! شکست یقینی ہے، اب خود کو انگریزوں کے حوالے کر دیجیے، جان تو بچ جائے گی۔''

راجہ خان کے ایسے جملوں کے جواب میں سلطان نے گرج کر اپنی زندگی کا آخری اور تاریخی فقرہ کہا تھا، جو آج تک ہر مجاہد کے دل کی دھڑکن ہے۔ سلطان نے راجہ خان کو شعلہ بار نگاہوں سے گھور کر دیکھا اور کہا:

''چپ رہ۔ کیا تو پاگل ہو گیا ہے... جانتا نہیں... شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔''

اس کے چند لمحوں بعد سلطان شیر کی طرح لڑتے لڑتے پیاسے ہی شہید ہو گئے... سلطان کی لاش رات تک انگریزوں کو نہ مل سکی۔ آخر کار راجہ خان نے ہی انگریزوں کو بلا کر سلطان کی لاش دکھائی۔

انگریزوں نے اسے انعام و اکرام سے نوازا۔ جاگیر بھی دی... راجہ خان نے اپنے باقی دن گیدڑ کی سو سالہ زندگی کی طرح پورے کیے... مگر آج کون ہے جو اس گیدڑ کا نام عزت سے لے... ہاں شیر میسور کی دھاڑ آج بھی دلوں کو گرما رہی ہے ان کا یادگار جملہ آج بھی تاریخ اور علم و حکمت کی کتابوں میں سنہرے حروف سے لکھا جاتا ہے۔

یارِ ناہنجار

اسلامی لشکر ''شیدو'' کے میدان جنگ کی طرف رواں دواں تھا، اس میں درجنوں قبیلوں کے ہزاروں مجاہدین شامل تھے۔ ہر قبیلے کا سردار اپنے گروہ کے ساتھ جوش و جذبے کے ساتھ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ تکبیر کے نعرے بلند ہو رہے تھے، جہادی آیات اور نظمیں پڑھی جا رہی تھیں۔ لشکر کے عمومی قائد سید احمد شہید رحمہ اللہ تھے۔

رات کے وقت اس لشکر نے ''اکوڑہ خٹک'' کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ طے یہ ہوا کہ آخرِ شب میں 3 بجے کے قریب آگے روانگی ہوگی۔ سید احمد شہید رحمہ اللہ کے سامنے کھانے کے لیے دستر خوان لگا دیا گیا۔ لشکر کے ایک سردار یار محمد خان کے نوکر کھانے پینے کی چیزیں لائے اور ان کے سامنے چن دیں... سید صاحب نے کھچڑی کے چند نوالے لے لیے۔ یار محمد خان کے ایک خادم نے گنڈیریاں بھی پیش کیں تھیں، سید صاحب نے چند گنڈیریاں چوسیں، اچانک ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ تڑپنے لگے۔ ان کے مخلص ساتھی دوڑ کر آئے، دوا دی گئی... سید صاحب کو قے پر قے ہونے لگی... آدھی رات اسی میں بیت گئی۔ 3 بجے کے قریب لشکر کی روانگی کا وقت ہوا، یار محمد خان کے کچھ نوکر ایک ہاتھی لے کر آئے اور کہا کہ سید صاحب کو گھوڑے پر سفر میں تکلیف ہوگی، ہاتھی پر آرام سے سفر کر سکیں گے، اس لیے خان صاحب نے یہ ہاتھی بھیجا ہے۔

سید صاحب کو کبھی ہوش آتا کبھی بے ہوش ہو جاتے تھے، اس حالت میں ان کے لیے آگے جانا بہت مشکل تھا مگر یار محمد خان نے بار بار اصرار کیا کہ سید صاحب کی لشکر کے ساتھ روانگی ضروری ہے۔ سید صاحب کو ذرا ہوش آیا تو مولانا شاہ اسماعیل شہید نے پوچھا:

''کیا حکم ہے۔'' سید صاحب نے اس حالت میں بھی لشکر سے پیچھے رہنا گوارا نہ کیا اور ساتھیوں کو کوچ کی اجازت دی۔ خادموں نے ہاتھی پر سوار کرایا اور لشکر روانہ ہو گیا۔

مجاہدین صبح شیدو کے میدان میں پہنچے، سکھوں کا لشکر بدھ سنگھ کی کمان میں سامنے کھڑا تھا، گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی۔ کچھ دیر بعد مجاہدین کے حملوں سے سکھوں کی صفیں تتر بتر ہونے لگیں، صاف نظر آتا تھا کہ مسلمان جیت گئے ہیں، سید احمد شہید کو ذرا ذرا ہوش تھا، چند مجاہدین نے انھیں جا کر فتح کی مبارک باد دی، مگر اسی لمحے یار محمد خان اپنی فوج کو لے کر میدان جنگ سے بھاگ نکلا، سکھوں کا ریلا آگے بڑھا اور انھوں نے سید صاحب کی جانب بڑھنا شروع کیا۔ سید صاحب ہاتھی پر بیٹھے ہوئے صاف نظر آرہے تھے۔ اس لیے انھیں نشانہ بنانا بہت آسان تھا۔ چوں کہ وہ پوری طرح ہوش میں نہ تھے، اس لیے جنگ کی صورتِ حال سے بے خبر تھے... سکھ انھیں گھیرے میں لینے کے لیے دوڑے آرہے تھے۔ شاہ اسماعیل شہید نے یہ دیکھ کر انھیں بڑی پھرتی سے ایک گھوڑے پر سوار کرایا اور چند مجاہدین کے ساتھ پہاڑی علاقے کی طرف روانہ کر دیا...

حملہ آور سکھوں کو ایک پٹھان سردار ''گوڈری شہزادے'' نے جان پر کھیل کر روکا اور اپنے جانبازوں سمیت لڑتے لڑتے شہید ہو گیا۔

سید صاحب کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا کر مجاہدین آیندہ کی حکمت عملی کے بارے میں سوچنے لگے۔ اب یہ واضح ہو گیا تھا کہ یار محمد خان ہی نے سکھ کمانڈر بدھ سنگھ سے ساز باز

کر کے سید صاحب کو زہر دلوایا تھا اور اسی نے جان بوجھ کر انھیں ہاتھی پر اس لیے سوار کرایا تھا کہ وہ سکھوں کی گولیوں کا نشانہ بن جائیں یا ان کے ہاتھوں گرفتار ہو جائیں۔

یار محمد خان نے سید صاحب سے غداری کیوں کی، اس کا جائزہ لینے سے پہلے ہمیں یہ جاننا ضروری ہے کہ سید صاحب کی تحریک کا مقصد کیا تھا، یہ کیسے اور کیوں شروع ہوئی، آیئے اس کا جواب اگلی سطروں میں تلاش کرتے ہیں۔

ٹیپو سلطان کے بعد برصغیر میں تحریکِ جہاد بظاہر ختم ہوگئی اور یہاں اسلام کا دفاع کرنے والا کوئی باقی نہ بچا۔ ایسے میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ نے یہ فتویٰ دیا کہ ہندوستان دارالحرب ہے... اس طرح انھوں نے مسلمانوں کو احساس دلایا کہ ان پر اس ملک کو کفار سے آزاد کرانے کی بھاری ذمہ داری عاید ہو چکی ہے۔ اس فتوے کی روشنی میں برصغیر کی آزادی کے لیے سربکف ہونے والے سب سے بڑے مجاہد سید احمد شہید رحمہ اللہ تھے۔ ان کے ساتھ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کے فرزند مولانا شاہ اسماعیل شہید بھی تھے۔ دونوں نے مل کر مسلمانوں کو جہاد کے لیے تیار کیا۔ اس وقت ایک طرف انگریزوں کی یلغار جاری تھی اور دوسری طرف پنجاب میں سکھوں نے اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔

بڑی سوچ بچار کے بعد سید احمد شہید نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر یہ فیصلہ کیا کہ صوبہ سرحد کے پٹھان قبائل کو ساتھ ملا کر وہاں ایک شرعی حکومت قائم کی جائے اور وہیں سے جہاد کا آغاز کر کے پہلے پنجاب کے مسلمانوں کو سکھوں سے نجات دلائی جائے اور پھر باقی ہندوستان کو انگریزوں سے پاک کیا جائے۔ چوں کہ صوبہ سرحد تک جانے کے لیے پنجاب سے گزرنا پڑتا تھا مگر وہاں سکھوں کا قبضہ تھا، اس لیے سید احمد شہید اپنے ساتھ کئی سو بہترین

تربیت یافتہ مجاہدین کو لے کر سندھ اور بلوچستان سے ہوتے ہوئے افغانستان پہنچے، وہاں سے بھی بہت سے مجاہد ان کے ساتھ ہو گئے۔ قندھار، غزنی اور کابل سے ہوتے ہوئے وہ آخر کار صوبہ سرحد میں داخل ہو گئے۔ یہاں مخلص مسلمانوں نے ان کا زبردست استقبال کیا، بہت سے قبائلی سرداران کے ساتھ ہو گئے۔ ان کی مدد سے انھوں نے اس علاقے میں شرعی حکومت قائم کی اور سکھوں سے جہاد کر کے کئی علاقے ان سے چھین لیے۔

یہ تحریک جہاد ضرور کامیاب ہو جاتی مگر افسوس کہ آستین کے کچھ سانپ ان مجاہدین کے ساتھ بھی شامل ہو گئے تھے۔ ان کی سازشوں اور غداریوں نے اس تحریک کو کامیابی سے ہم کنار نہ ہونے دیا... ان غداروں میں سب سے پہلا نام یار محمد خان کا ہے۔ سید احمد شہید رحمہ اللہ جب افغانستان سے پشاور پہنچے تھے تو اس وقت سرحد کے اکثر علاقوں میں یار محمد خان، سلطان محمد خان اور دوست محمد خان تین بھائیوں کی حکومت تھی۔ یہ تینوں آپس میں لڑتے رہتے تھے، سید احمد شہید رحمہ اللہ نے جہاد کے نام پر ان تینوں کو جمع کیا، ان کے اختلافات دور کیے اور ان کے تمام مسائل حل کرا دیے۔ یہ تینوں جہاد کی بیعت کر کے مجاہدین کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ مگر جب مجاہدین کو فتوحات نصیب ہونے لگیں اور سید احمد شہید رحمہ اللہ کا نام ہر طرف گونجنے لگا تو یار محمد خان کے دل میں حسد پیدا ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اب سرداری میرے ہاتھ سے نکل کر سید احمد شہید کے پاس چلی گئی ہے۔ اس حسد کے باعث اس نے سید صاحب کو ختم کرنے کے لیے انھیں زہر دینے کی سازش کی تھی اور لڑائی میں سکھوں کو جتوانے کے لیے میدان جنگ سے ہٹ گیا تھا۔

شیدو کی جنگ ہندوستان کی تاریخ کی ایک نہایت اہم جنگ تھی۔ یہ جنگ مسلمانانِ ہند کے مستقبل پر اثر انداز ہوئی۔ اس جنگ میں اسلامی لشکر میں یوسف زئی قبائل کے 70

ہزار افراد اور پشاور کے سرداروں، یار محمد خان اور اس کے بھائیوں کے بیس پچیس ہزار سے زیادہ تجربہ کار سپاہی تھے، باقی سید صاحب کے پرانے ساتھی تھے۔ ان سب کی تعداد مل کر ایک لاکھ تک پہنچ رہی تھی۔ ہندوستان کو آزادی دلانے کے لیے جہاد کی نیت سے ایک پرچم تلے اتنے لڑنے والے نہ پہلے جمع ہوئے تھے نہ بعد میں... اگر اس وقت یار محمد خان غداری نہ کرتا تو یہ لشکر سکھوں کو عبرتناک شکست دے کر پورے پنجاب سے بے دخل کر سکتا تھا اور اس کے بعد مسلمانوں کی یہ متحدہ طاقت انگریزوں سے ٹکر لے کر پورے برصغیر کو آزاد کرا سکتی تھی... مگر یار محمد خان جنگ سے پہلے ہی سکھ کمانڈر بدھ سنگھ سے مل گیا تھا۔ اس کی غداری نے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔

سکھ حکمران رنجیت سنگھ نے اس معرکے میں کامیابی کو سکھوں کی فتح قرار دیا... اس نے خوش ہو کر لاہور میں چراغاں کرایا اور پورے پنجاب میں جشن منانے کا حکم دیا...

قدرتِ الٰہیہ یار محمد خان جیسے غداروں کو نمونہ بنا کر چھوڑتی ہے۔ یار محمد خان کا انجام بھی بہت برا ہوا۔

سید صاحب اس شکست کے بعد بونیر اور سوات سے ہوتے ہوئے پنجتار میں آ کر مقیم ہوئے اور اس جگہ کو اپنا مرکز بنا لیا۔ کچھ عرصے بعد یار محمد خان اپنی طاقت کے نشے میں ایک لشکر لے کر سید صاحب سے مقابلے کے لیے نکلا اور گڑھی ہریانہ میں کیمپ لگایا۔

سید صاحب نے مسلمانوں کے درمیان خوں ریزی سے بچنے کے لیے اسے صلح و صفائی اور بات چیت کی پیش کش کی مگر وہ نہ مانا، بلکہ اس نے سید صاحب کے قاصد کو کوڑے لگوائے اور دھمکی دیتے ہوئے کہا:

''سید کے آدمی ایک ایک کر کے سب مارے جائیں گے...''

سید صاحب تک یہ پیغام پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان پر یہ الفاظ جاری کر دیے:

''اس سے جا کر کہو کہ تو ہمیں کیا زک دے گا۔ ان شاء اللہ تو خود پیشاب پی کر مرے گا۔''

اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ کو سچ کر دکھایا۔

مجاہدین تعداد میں کم تھے، اس لیے کھلے میدان میں نہیں لڑ سکتے تھے۔ سید صاحب نے آٹھ سو مجاہدین کو مولانا اسماعیل شہید کے ساتھ ان پر شبِ خون مارنے کا حکم دیا۔

ان مجاہدین کا شبِ خون اتنا اچانک تھا کہ یار محمد خان کا سارا لشکر تتر زخمی حالت میں صرف ایک نوکر کے ساتھ جان بچا کر بھاگا۔ راستے میں جہ کا دور دور تک پتا نہ تھا، اس کا پیاس سے برا حال تھا۔ بار بار نوکر سے کہتا:

''پانی پلا دے''۔

نوکر تنگ آ گیا... اس نے جھلا کر کہا:

''پانی یہاں کہاں ہے!! یہاں تو صرف پیشاب ہی مل سکتا ہے۔

یار محمد خان اللہ کے عذاب کا نشانہ بن چکا تھا، اسے اتنی شدید پیاس لد تڑپ کر بولا:

''لا! پیشاب ہی پلا دے''۔ نوکر نے پیشاب کر کے اس بدبخت کو پلا دیا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد یہ غدار وہیں ویرانے میں مر گیا۔ سچ کہتے ہیں:

''برے کا برا انجام۔''

دغابازی کا انجام

سید احمد شہید رحمتہ اللہ علیہ نے پنجتار کو اپنا مرکز بنایا اور آس پاس کے علاقوں میں شرعی نظام قائم کیا تو ''ھنڈ'' کے حاکم خادی خان کے دل میں حسد کے جذبات اُبھرنے لگے۔ وہ سید صاحب کے پرانے ساتھیوں میں سے تھا اور بظاہر مجاہدین کے ساتھ تھا مگر آہستہ آہستہ اس کے مزاج میں تبدیلی ظاہر ہونے لگی حتیٰ کہ سید صاحب اور مجاہدین کے نام سے بھی اسے چڑ ہوگئی۔ ایک بار ایک مجاہد ھنڈ کے علاقے سے گزرا تو خادی خان کے آدمیوں نے اسے پکڑ لیا، خادی خان نے حکم دیا کہ اس کا سارا سامان چھین لو اور دریائے سندھ میں غوطے دے کر یہاں سے مار بھگاؤ۔ جب بار بار اس قسم کے واقعات پیش آئے تو سید صاحب کو بڑی پریشانی ہوئی، اپنوں کی یہ بے وفائی ان کے لیے دردناک تھی۔ کچھ دنوں بعد خادی خان نے سکھوں کو اکسانا شروع کیا کہ سرحد کے سردار تمہاری اطاعت سے اس لیے آزاد ہوگئے ہیں کہ انھیں سید صاحب نے اپنے ساتھ ملالیا ہے۔ تمھیں اس معاملے پر غور کرنا چاہیے۔ مطلب یہ تھا کہ سید صاحب کے خلاف بڑا حملہ کرنا ضروری ہے۔

خادی خان نے اس کے ساتھ ساتھ اپنے جاسوس بھی چھوڑ رکھے تھے جو مجاہدین کی سرگرمیوں اور منصوبوں سے سکھوں کو باخبر کررہے تھے۔ اس وجہ سے مجاہدین کی بعض مہمیں ناکام ہونے لگیں۔

سید صاحب نے خادی خان کو سمجھانے کے لیے مقامی علماء اور سرداروں کی عام مشاورت طلب کی، جہاد کی اہمیت اور خلافت کی ضرورت پر زور دیا، علماء کے تابع رہنے کا اقرار اور شریعت کی پابندی کا وعدہ لیا۔ سب نے تائید کی، اطاعت کا وعدہ کیا۔ خادی خان بھی آیا ہوا تھا۔ وہ بھِر کر بولا:

''سیاست سرداروں کا کام ہے، ملاؤں کو سیاست کا کیا پتا، ان کی جو بات سمجھ میں آئے گی ہم مانیں گے، جو سمجھ میں نہیں آئے گی نہیں مانیں گے، علماء ہمارے تابع ہیں۔ ہم علماء کے تابع نہیں۔''

یہ سن کر سید صاحب کا رنگ غصے سے سرخ ہو گیا۔ فرمایا:

''علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ دین اور دُنیا دونوں کے معاملات یہی لوگ بہتر سمجھتے ہیں، مسلمانوں کو ان کی بات کسی ہچکچاہٹ کے بغیر ماننی چاہیے۔''

''ہم جاہل لوگ ہیں، ہماری سمجھ میں آپ کی باتیں نہیں آتیں۔'' خادی خان یہ کہہ کر لوٹ گیا۔

وہ سید صاحب کے خلاف اب پہلے سے بڑھ کر سازشوں میں مصروف ہو گیا۔ اس نے سکھوں کو بار بار مجاہدین پر حملے کے لیے اُکسایا، آخر کار دس ہزار سکھوں کا لشکر پنجتار پر حملے کے لیے اُمڈ آیا، خادی خان بھی ان کے ساتھ تھا اور انھیں مشورے دے رہا تھا۔

سکھوں نے پنج تار کا محاصرہ کر کے زبردست حملہ کیا۔ ان کے ساتھ فرانس کا فوجی جنرل وینٹورا بھی تھا، مگر مجاہدین نے جنگِ خندق کے واقعے سے سبق لیتے ہوئے محاصرے کی حالت میں بھی پوری ہمت سے ان کا مقابلہ کیا۔ اللہ کی مدد شامل حال ہوئی اور سکھ ناکام ہو کر واپس چلے گئے۔

لڑائی کے بعد سید صاحب نے خادی خان کو ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی۔ شاہ اسماعیل شہید کو اس کے پاس بھیجا۔ خادی خان نے ان کی نصیحتوں کے جواب میں اکڑ کر کہا:

''ہم سید صاحب کی طرح ملا مولوی نہیں، ہم سردار اور حاکم لوگ ہیں، ہماری شریعت جدا ہے ان کی جدا، ہم ان کی شریعت پر نہیں چل سکتے۔ وہ جو کچھ کر سکتے ہیں کر لیں۔''

خادی خان کو سبق سکھانا اب ضروری ہو گیا تھا، سید صاحب نے شاہ اسماعیل کو مجاہدین کے ساتھ اس کی طرف روانہ کیا۔ خادی خان کو معلوم ہوا تو قہقہہ مار کر بولا:

''سید کی کیا جرأت کہ اِدھر کا رُخ کرے، اگر وہ درویش اِدھر آ بھی جائے تو ہمارے دیہاتی ہی اس کے لیے کافی ہیں۔''

مگر صبح سویرے مجاہدین کی فائرنگ کی آواز سے اس کی آنکھوں کے سامنے موت ناچنے لگی۔ ایسا گھبرایا کہ اپنے بچاؤ کا انتظام بھی نہ کر سکا، اس بے تابی میں حویلی کی چھت پر چڑھ کر اِدھر اُدھر دوڑنے لگا اور مجاہدین کی طرف سے آنے والی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ مجاہدین میں سے کسی کو خراش تک نہ آئی، جب کہ ''ھنڈ'' کے باشندوں میں سے صرف خادی خان اور اس کا ایک ساتھی قتل ہوا۔ عوام کو کوئی گزند نہ پہنچی۔ اس طرح غدار اپنے انجام کو پہنچا۔

بلا کا فریبی

پائندہ خان تنولی امب کے علاقے کا حاکم تھا، یہ علاقہ کشمیر کا دروازہ تھا۔ سید احمد شہید کشمیر میں اسلامی خلافت قائم کرنے کے لیے وہاں مجاہدین کو روانہ کرنا چاہتے تھے، راستے میں پائندہ خان کا علاقہ پڑتا تھا۔ یہ شخص بظاہر بڑا میٹھا مگر اندر سے بڑا فریبی اور مکار تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ سید احمد شہید اس کے علاقے سے گزر کر کشمیر پر لشکر کشی کا ارادہ کر رہے ہیں تو اسے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں مجاہدین اس کے علاقے پر قبضہ نہ کرلیں۔ حالانکہ مجاہدین کا ایسا کوئی منصوبہ نہیں تھا، سید صاحب تو اس سے اچھے تعلقات قائم کرنا چاہتے تھے۔

سید صاحب مجاہدین کے ساتھ جب اس کے علاقے کے قریب پہنچے تو پائندہ خان نے ایک گھناؤنا منصوبہ ترتیب دے ڈالا۔ اس نے پیغام بھجوایا:

''آپ دریا کے ساتھ میدان میں برگد کے درخت کے قریب چند آدمیوں کے ساتھ تشریف لے آئیں، وہیں میں آپ کی زیارت کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔''

پائندہ خان کی جانب سے ''چند آدمیوں'' کی شرط لگانے پر مجاہدین کو شک ہوا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ نہ ہو۔ مگر سید صاحب نے اسے منظور کرلیا۔ آپ دس بارہ افراد کے ساتھ پہاڑ سے اترے، سامنے دریائے سندھ کا ساحلی میدان تھا۔ وہاں برگد کا درخت بھی تھا، سید صاحب

نے برگد کے درخت کے پاس پہنچ کران بارہ میں سے بھی صرف دو افراد مولانا شاہ اسماعیل اور خواجہ محمد کو ساتھ لیا اور آگے چلے... اِدھر پائندہ خان چار سو گھڑ سواروں سمیت موجود تھا۔سید صاحب کو آتا دیکھ کر وہ اپنے دو ساتھیوں کو لے کر آگے بڑھا۔دریا کے کنارے ایک ٹیلے پر سید صاحب اور پائندہ خان آمنے سامنے بیٹھ گئے،پائندہ خان نے مکمل زرہ پہنی ہوئی تھی،سر پر لوہے کا خود تھا،صرف اس کی آنکھیں نظر آرہی تھیں جن میں ایک شرارت چمک رہی تھی۔ابھی گفتگو شروع ہی ہوئی تھی کہ پائندہ خان کے اشارے پر اس کے لشکر کے چار سو گھڑ سوار بجلی کی طرح آگے بڑھے۔گھوڑوں کی ٹاپوں سے دریائے سندھ کا پتھریلا ساحل گونجنے لگا،یقیناً یہ سوار سید صاحب کو گرفتار کرنا چاہتے تھے مگر اچانک دریا کے کنارے چٹانوں کے پیچھے سے درجنوں مجاہدین لپک لپک کر سامنے آگئے اور بندوقیں سیدھی کر کے پائندہ خان کو گھیر لیا۔

دراصل شاہ اسماعیل شہید نے پائندہ خان کی بدنیتی کو بھانپ لیا تھا اور سید صاحب کو بتائے بغیر مجاہدین کا ایک دستہ دریا کے کنارے اس طرح چھپا دیا تھا کہ کسی کو پتا نہ چل سکا۔

پائندہ خان کے گھڑ سواروں نے اپنے سردار کو بندوقوں کی زد میں دیکھا تو گھبرا کر رُک گئے۔پائندہ خان سید صاحب کی منتیں کرنے لگا،معافیاں مانگنے لگا،سید صاحب نے اس سے آئندہ اطاعت کا وعدہ لے کر معاف کر دیا۔

کچھ دنوں بعد مجاہدین کو کشمیر جانے کے لیے دریائے سندھ پار کرنے کی ضرورت پڑی تو پائندہ خان نے ایک بار پھر غداری کرتے ہوئے انھیں راستے دینے سے انکار کر دیا۔سید صاحب نے اس کی سرکشی دیکھ کر حملے کی تیاری کی اور شاہ اسماعیل شہید کو لشکر کے ساتھ روانہ فرما دیا۔شاہ اسماعیل شہید نے مجاہدین کے کئی الگ الگ دستے بنا کر انھیں مختلف راستوں

سے حملے کا حکم دیا۔ پائندہ خان کو اطلاع ملی تو بڑا گھبرایا۔ ایک بار پھر اس نے سازش تیار کی، مولانا شاہ اسماعیل کو راتوں رات لکھا:

''ہم آپ کے فرمانبردار ہیں، اپنی گستاخیوں سے توبہ کرتے ہیں، صلح کے طلب گار ہیں، آپ پانچ دس آدمی لے کر کل مجھ سے ملیں، میں بھی اتنے ہی آدمی لے کر اطاعت کے وعدے کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔''

شاہ اسماعیل شہید نے یہ خط پڑھ کر ان تمام دستوں کو جو آگے جا چکے تھے، پیغام بھجوادیا کہ صبح کو جو حملہ طے تھا، اسے ملتوی کر دیا گیا ہے، کیونکہ صلح کی بات چیت ہونے والی ہے، سب واپس آجائیں۔ یہ پیغام ان مجاہدین کو اس وقت ملا جب وہ ''امب'' پہنچ چکے تھے اور انھیں سامنے میدان میں پائندہ خان کی فوجوں کی صفیں تیار نظر آرہی تھیں۔ وہ سمجھ گئے کہ پائندہ خان مولانا سے دھوکا کر رہا ہے۔ خود تو فوجیں تیار کیے ہوئے ہے مگر انھیں صلح میں الجھا رہا ہے۔ مگر حکم کی تعمیل میں مجاہدین واپس ہو گئے۔

اس دوران مولانا اسماعیل شہید پائندہ خان سے ملاقات کے لیے جانے والے تھے مگر ان کے ساتھیوں نے انھیں پائندہ خان پر اعتبار کرنے سے روکا اور چند گھنٹے انتظار کا مشورہ دیا۔ مولانا رُک گئے۔ پائندہ خان مولانا کے نہ آنے سے تھوڑا سا پریشان تو ہوا مگر جب اس نے دیکھا کہ مجاہدین کے دستے دور سے نمودار ہوئے ہیں اور کچھ آگے آکر پھر واپس پلٹ گئے ہیں تو اس کی ہمت بندھ گئی۔ اب اس نے بے خوف ہو کر مجاہدین کے مرکزی کیمپ پر حملہ کر دیا۔

مرکزی کیمپ میں دو سو تجربہ کار اور پرانے مجاہد موجود تھے جو پورے اسلامی لشکر کا خلاصہ تھے، بڑے بڑے علماء بھی تھے۔ پائندہ خان کو یقین تھا کہ اگر وہ انھیں قتل کرنے میں

کامیاب رہا تو اسلامی لشکر کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ چنانچہ وہ ایک ہزار افراد لے کر ان پر چڑھ دوڑا۔ مگر ان دو سو مجاہدین میں سے ہر ایک سینکڑوں پر بھاری تھا، انھوں نے ایسا ڈٹ کر مقابلہ کیا کہ پائندہ خان بھاگ نکلا۔

کچھ عرصے بعد پائندہ خان نے ایک بار پھر صلح کی درخواست کی اور خود پیش کش کی کہ میں صلح کی ضمانت دینے کے لیے اپنا بیٹا یرغمال کے طور پر آپ کے حوالے کر دوں گا۔ اس ضمانت پر سید صاحب کو یقین آ گیا، صلح کی پیش کش قبول کر لی۔ پائندہ خان کا بیٹا آیا تو سید صاحب نے اسے اختیار دیا کہ جہاں چاہے رہے۔ اس نے چھتر بائی میں اپنے باپ کی حویلی کی ایک کوٹھری میں رہائش پسند کی۔ کچھ دن وہ یہیں رہا، مجاہدین نے اس کے آرام کا خوب خیال رکھا۔ پندرہ دن بعد لڑکے کی والدہ نے سید صاحب کو رقعہ بھیج کر درخواست کی کہ میں بچے کو ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں، اسے کچھ دنوں کے لیے واپس بھجوا دیں۔ سید صاحب نے فوراً اجازت دے دی۔

پائندہ خان کے جو آدمی لڑکے کو لینے آئے تھے انھوں نے اس دن ایک گائے ذبح کر کے مجاہدین کی دعوت کی۔ اگلے دن وہ لڑکے کو ساتھ لے گئے۔ مجاہدین نے دیکھا کہ وہ گائے کی کھال بھی ساتھ لے جا رہے ہیں، اس وقت تو کسی کو شک نہ ہوا مگر ان کے جانے کے بعد کسی نے کوٹھری میں جھانک کر دیکھا تو لگتا تھا کسی نے زمین میں گڑھا کھود کر اسے دوبارہ برابر کر دیا۔ تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ پائندہ خان نے چھتر بائی میں اپنی دولت اور خزانہ اس کوٹھری میں دفن کر رکھا تھا۔ لڑکے کو یرغمال کے طور پر بھیجنا تو بس ایک بہانہ تھا۔ لڑکے اور اس کو لینے کے لیے آنے والے آدمیوں نے راتوں رات گڑھا کھود کر خزانہ نکال لیا تھا اور اسے گائے کی کھال میں لپیٹ کر ساتھ لے گئے تھے۔

پائندہ خان کی جھوٹی صلح کا بھانڈا تو پھوٹ ہی چکا تھا۔ حسبِ توقع اس نے دوبارہ اپنے ''یرغمالی'' بیٹے کو بھی کبھی واپس نہ بھیجا۔

پائندہ خان نے سید صاحب کا زور بڑھتا ہوا دیکھا تو سکھوں سے کھلم کھلا دوستانہ گانٹھنے لگا... اس نے سکھ سردار ہری سنگھ کے ساتھ مل کر سید صاحب کے خلاف محاذ بنانے کی کوشش کی اور کہا:

''ہمارا ملک سید بادشاہ نے چھین لیا ہے۔ ہم اِدھر اُدھر آوارہ پھرتے ہیں، کوئی ٹھکانہ نہیں، اگر تم مدد کرو تو ہمارا ملک ہمیں مل جائے۔''

ہری سنگھ نے جواب دیا:

''پائندہ خان، تم غدار اور دھوکے باز انسان ہو... ہمیں تم پر اعتبار نہیں۔''

مگر پائندہ خان نے بہت منتیں کر کے اسے راضی کر ہی لیا۔

دونوں نے اپنی فوجیں جمع کر کے ''پھولڑے'' کے مقام پر سید احمد شہید کے کیمپ پر اچانک حملہ کیا، مجاہدین بے خبر تھے، پھر بھی اس جواں مردی سے مقابلہ کیا کہ دشمنوں کے چھکے چھوٹ گئے اور انھیں فرار ہونا پڑا۔

مجبور ہو کر آخر پائندہ خان نے سید صاحب سے پھر صلح کی درخواست کی، گزشتہ غلطیوں پر معذرت کی اور شریعت پر عمل کا وعدہ کیا، سید صاحب نے نہایت فراخ دلی کے ساتھ اس بار بھی اس کی معذرت قبول کی۔

جب تک مجاہدین کی قوت برقرار رہی، پائندہ خان نے کوئی گڑبڑ نہ کی مگر کچھ عرصے بعد جب مجاہدین کو کئی سرداروں کی عمومی بغاوت کا سامنا ہوا تو پائندہ خان نے بھی اپنے علاقے

میں بغاوت کردی...اور مجاہدین کو کشمیر سے نکال دیا۔

ایسے ہی غداروں کے سبب آخرکار یہ تحریکِ مجاہدین کامیاب نہ ہوسکی۔ اگر پائندہ خان جیسے طاقتور سردار مجاہدین کا ساتھ دیتے تو پورا کشمیر اسی وقت سکھوں اور ہندوؤں سے آزاد ہوکر اسلامی ریاست بن جاتا، یہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان پر اسلامی خلافت قائم ہوجاتی، مگران سرداروں کی غداری کے باعث اسلامی خلافت کی یہ تحریک بالاکوٹ کے پہاڑوں میں دفن ہوگئی۔ خود پائندہ خان کا علاقہ بھی اس کے کچھ عرصے بعد سکھوں کے قبضے میں آگیا۔ کشمیر کی آزادی کا خواب تب سے اب تک خواب ہی ہے... اس کی تعبیر نہ معلوم مسلمانوں کی کون سی نسل دیکھ پائے گی؟

غدار ہی غدار

نقارے اور ڈھول بج رہے تھے... ان کی آواز ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک پہنچ رہی تھی... جہاں جہاں یہ آواز پہنچتی، وہاں بھی کچھ لوگ ڈھول پیٹنے لگتے... اس آواز میں ایک عجیب سی ہیبت تھی... لگتا تھا، کوئی لاشوں پر بین کر رہا ہے۔ مجاہدین اپنے اپنے ٹھکانوں پر ڈھولوں کی یہ دھمک سن کر حیران ہو رہے تھے۔

''کیا بات ہے... نقارے بج رہے ہیں، ڈھول پیٹے جا رہے ہیں؟'' مجاہدین نے گاؤں والوں سے پوچھا۔

''کوئی فکر کی بات نہیں... جوار کاٹنے کا موقع ہے... سب دیہاتوں والے ایک دوسرے کو اس کی اطلاع دے رہے ہیں کہ کل سے جوار کی کٹائی شروع کرنی ہے۔'' گاؤں والوں نے جواب دیا...

مجاہدین بے فکر ہو کر اپنے معمولات میں مشغول ہو گئے۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ ان کے خلاف ایک بھیانک سازش تیار ہو چکی ہے... یہ نقارے جوار کی کٹائی کے لیے نہیں بج رہے تھے۔ یہ تو سر بسجود گردنوں کی کٹائی کا پیشگی ماتم کر رہے تھے۔

یہ وہ مجاہدین تھے جو سید احمد شہید رحمہ اللہ کے ہمراہ اپنا وطن چھوڑ کر صوبہ سرحد آ گئے

تھے۔ تاکہ خدا کی زمین پر خدا کا نظام نافذ کریں اور برصغیر کو کفار کے پنجے سے آزاد کرائیں۔ سید احمد شہید رحمہ اللہ نے صوبہ سرحد کے علاقے ''پنج تار'' میں مرکز قائم کیا تھا جہاں سینکڑوں مجاہدین مقیم تھے۔ ان کے علاوہ سینکڑوں مجاہدین دوردراز کی بستیوں، دیہاتوں اور شہروں میں پھیلے ہوئے تھے اور وہاں کا انتظام سنبھالے ہوئے تھے، ان کے عدل وانصاف اور اسلامی نظام سے عوام بہت خوش تھے مگر اندر ہی اندر بہت سے لوگ مجاہدین کے خلاف ہو چکے تھے، وہ انھیں قتل کرانا چاہتے تھے، انھیں مجاہدین کے خون کا پیاسا کس نے بنایا، یہ بھیانک حقیقت مجاہدین کا ان مول خون بہہ جانے کے بعد کھلی جسے ہم بالکل آخر میں ذکر کریں گے۔

پشاور کا حاکم سلطان محمد خان سید احمد شہید کی تحریک خلافت کے ابتدائی حامیوں میں سے تھا۔ جب سید صاحب ہندوستان سے سرحد آئے تو اس نے ان کی بڑی میزبانی کی، دعوتیں کیں، ان کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کی۔ ان دنوں سلطان محمد کی اپنے بھائی دوست محمد خان سے دشمنی چل رہی تھی، سید صاحب نے ان دونوں میں صلح کرانے کے لیے بڑی کوشش کی، اپنے بہت سے اہم کام ترک کر کے پورے چالیس روز وہاں قیام کیا اور ان کی دشمنی ختم کرائی۔ کچھ عرصے تک سلطان محمد سید صاحب کا مددگار رہا مگر پھر اس کے دل میں غداری کے جراثیم پیدا ہو گئے۔ وہ غدار یار محمد خان کا سگا بھائی تھا، یار محمد کی غداری اور عبرت ناک موت کے بعد وہ مشتعل ہو گیا، سید احمد شہید اور ان کے مجاہدین سے اس کی عداوت روز بروز بڑھنے لگی... اس نے کئی بار مجاہدین کو دھوکا دیا، غداری کی مگر ہر بار سید صاحب درگزر کرتے رہے۔

اپنے بھائی یار محمد کی موت کے بعد اس نے اعلان کیا کہ میں مجاہدین سے اپنے بھائی کا انتقام لوں گا۔ یہ کہہ کر اس نے ایک لشکر ساتھ لیا اور پشاور سے ہنڈ جا پہنچا جہاں قلعے میں پچاس ساٹھ مجاہدین قیام پذیر تھے۔ سلطان محمد خان نے قلعے کا محاصرہ کرلیا، کئی دن گزر گئے وہ قلعے پر قبضہ نہ کرسکا۔ آخر اس نے مجاہدین سے وعدہ کیا کہ اگر وہ قلعہ خالی کردیں اور ہتھیار ڈال دیں تو انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ مجاہدین بھوک پیاس سے لاچار تھے، اس کے وعدے پر اعتبار کرلیا۔ اس طرح سلطان محمد خان نے قلعے کا دروازہ کھلوالیا۔ مجاہدین باہر آئے تو سلطان محمد نے انھیں گرفتار کرلیا اور کہا:

''ان سب کو یار محمد خان کی قبر پر ذبح کروں گا۔''

پنج تار میں سید صاحب کو یہ معلوم ہوا تو فوراً اعلان کیا کہ سلطان محمد خان کے مرکز پشاور پر حملے کی تیاری کرو۔ مجاہدین کوچ کی تیاری کرنے لگے۔ سید صاحب نے یہ اعلان صرف سلطان محمد خان کو ڈرانے کے لیے کیا تھا، یہی ہوا سلطان محمد خان کو خبر ہوئی تو گھبرا کر بڑی افراتفری میں پشاور کی طرف بھاگا اور یوں ہنڈ کا قلعہ خالی ہوگیا۔ اس ہنگامے میں قیدی مجاہدین کو بچ نکلنے کا موقع مل گیا، وہ قید خانے کی دیوار توڑ کر نکل آئے اور سید صاحب سے آملے۔ سید صاحب نے ہنڈ پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔

پشاور جا کر ایک عرصے تک سلطان محمد خان سید صاحب سے جنگ کی تیاری کرتا رہا۔ پھر کئی سرداروں کو ساتھ ملا کر ایک بڑا لشکر ترتیب دیا اور سید صاحب کے مقابلے پر آیا... اس نے سید صاحب کو پیغام بھجوایا:

''تم نے یار محمد کے خلاف رات کو حملہ کیا تھا، اس لیے کامیاب ہوگئے۔ اب دو پہر کو ہم

سے مقابلہ کر کے دیکھنا۔"

سید صاحب نے جواب بھجوایا:

"جس خدا نے رات کو ہمیں تمہارے بھائی پر فتح دی تھی، وہی دن کو تم پر فتح عنایت کرے گا... بہتر یہی ہے کہ تم خدا سے ڈرو اور ناحق پر اصرار نہ کرو، برائی کا انجام برا ہوتا ہے۔"

سلطان محمد خان نے یہ پیغام لانے والے مجاہدین کو ڈانٹ کر بھگایا اور کہا:

"ان قصے کہانیوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے... خبردار!" پھر سید کا پیغام ہمارے پاس مت لانا۔

سمجھانے بجھانے کی سب کوششیں ناکام رہیں اور مردان کے قریب "مایار" کے مقام پر مجاہدین کا سلطان محمد خان کی فوجوں سے زوردار معرکہ ہوا، سلطان محمد خان کے اکثر سپاہی شراب پی کر میدان میں کودے تھے، ان میں ایک انگریز افسر بھی شامل تھا... زبردست جنگ کے بعد سلطان محمد کو شکست ہوئی، وہ جان بچا کر بھاگا اور پشاور جا کر دم لیا۔

کچھ دنوں بعد سید صاحب بھی مردان سے ہوتے ہوئے پشاور کے قریب جا پہنچے، سلطان محمد خان نے گھبرا کر معافی چاہی اور اطاعت کا وعدہ کیا۔ سید صاحب نے پشاور پر قبضہ کرنے کے بعد سلطان محمد خان کی معذرت قبول کر لی۔ شہر میں اسلامی نظام نافذ کر کے واپس چلے آئے، حکومت سلطان محمد خان کے پاس ہی رہنے دی۔ یہ سید صاحب کے حوصلے کی انتہا تھی۔

سید صاحب کے اس لطف و کرم کے باوجود سلطان محمد غداری سے باز نہ آیا۔ اب اس نے میدان میں مقابلہ کرنے کی بجائے خفیہ طور پر مجاہدین کے قتل عام کا منصوبہ بنایا، اس

کے ساتھ صوبہ سرحد کے درجنوں دوسرے سردار بھی اس سازش میں شریک تھے۔ان سب نے طے کیا کہ جن جن دیہاتوں، بستیوں اور شہروں میں مجاہدین موجود ہیں، وہاں یک دم بغاوت کر کے ان سب کو شہید کر دیا جائے۔ان دنوں جوار کی فصل کٹنے والی تھی۔سازشیوں نے یہ بھی طے کیا کہ جس رات مجاہدین کا قتل عام ہو، اس سے پہلے دن تمام بستیوں میں ڈھول اور نقارے بجائے جائیں، تاکہ ہمارے آدمی ہتھیار تیار کر لیں، اگر کوئی پوچھے تو کہا جائے کہ یہ جوار کاٹنے کی تیاری کی اطلاع ہے۔

عشاء کا وقت تھا، اندھیرا خوب پھیل چکا تھا کہ اچانک اس خونی کھیل کا آغاز ہو گیا۔ مولانا مظہر علی اور ارباب فیض اللہ سید احمد شہید کی جماعت کے بزرگوں میں سے تھے، وہ پشاور میں مقیم تھے، غداروں نے انھیں اپنے ہاں دعوت پر بلایا ہوا تھا، انھیں وہیں شہید کر دیا گیا...دوسرے علاقوں میں بھی اندھیرا پھیلتے ہی قتل عام شروع ہو گیا۔اکثر مجاہدین عشاء کی نماز میں مشغول تھے یا اس کے لیے وضو کر رہے تھے، انھیں وہیں خون میں نہلا دیا گیا۔

ایک گاؤں کے مجاہدین نے باغیوں سے بچنے کے لیے مسجد میں پناہ لی اور کمرے کا دروازہ بند کر لیا، باغیوں نے مسجد کو آگ لگانے کی تیاری کی، گاؤں کے لوگوں نے بمشکل انھیں روکا، علاقے کے علماء اور نیک لوگ قرآن ہاتھوں میں لے کر آگے آ گئے، عورتوں اور بوڑھوں نے اللہ اور رسول کا واسطہ دے کر کہا:

''ان پردیسی مسلمانوں کو قتل نہ کرو۔یہ مجاہد ہیں، ہجرت کر کے آئے ہیں۔''

مگر باغی نہ مانے اور مسجد کو آگ لگانے لگے، مجاہدین یہ دیکھ کر مسجد سے باہر نکل آئے اور تلواریں بے نیام کر لیں، باغیوں نے مسجد میں تو انھیں کچھ نہ کہا۔مگر جب وہ مسجد سے نکل کر بستی کے باہر ایک ندی کے کنارے پہنچے تو باغیوں نے وہیں گھیر کر سب کو شہید کر ڈالا۔

بعض دیہاتوں میں علماء اور مسجد کے اماموں نے ایک ایک دو دو مجاہدوں کو حجروں میں چھپا کر رکھا اور بعد میں چپکے چپکے علاقے سے باہر پہنچا دیا، یہ گنتی کے چند افراد ہی زندہ سلامت سید صاحب کے پاس پہنچ سکے، باقی سب مظلومانہ انداز میں شہید ہو گئے۔

کلمہ پڑھنے والوں اور اسلام کا دعویٰ کرنے والوں کے ہاتھوں مجاہدین کے اس قتل عام سے سید احمد شہید رحمہ اللہ کی کمر ٹوٹ گئی۔ وہ سمجھ گئے کہ اس علاقے کے لوگوں کے دلوں میں مجاہدین سے ایسی نفرت بیٹھ چکی ہے جسے دور کرنا انتہائی مشکل ہے...یہی وجہ تھی کہ یار محمد خان، سلطان محمد خان، خادی خان اور پائندہ خان جیسے بااثر سردار بار بار غداریاں کر رہے تھے...اتنے غداروں کے بیچ میں آخر تحریکِ جہاد کیسے کامیاب ہو سکتی تھی۔ باوجود اس کے سید صاحب اور ان کے ساتھی حیران تھے کہ ان لوگوں نے ہمارے خلاف ایسی نفرت کا مظاہرہ کیوں کیا۔ سید صاحب نے اب یہ علاقہ چھوڑ کر بالاکوٹ اور کشمیر کی طرف ہجرت کا فیصلہ کر لیا تھا مگر جانے سے پہلے انھوں نے قبائلی سرداروں اور عوام کی ضیافت کی اور اس دوران ان سے مخاطب ہو کر کہا:

''ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اپنے وطن سے ہجرت کر کے جہاد کے لیے آپ کے ملک میں آئے...آپ نے ہمارے ہاتھ پر بیعت کی اور شریعت پر عمل کا وعدہ کیا، پھر ہم سے کیا قصور ہوا کہ آپ سب اچانک ہمارے جانی دشمن بن گئے...اور یک دم غداری کر کے ہمارے سینکڑوں مجاہد شہید کر ڈالے... ہمارے مجاہدین کے ساتھ وہ سلوک کیا جو کافروں کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا...اگر ہم سے ایسا ہی کوئی قصور صادر ہوا ہے تو ہمیں آگاہ کریں۔''

اس پر سب لوگ خاموش رہے۔ کسی نے وجہ نہ بتائی، سید صاحب کے بار بار اصرار پر

بھی کسی نے کچھ نہ بتایا تو انہوں نے دو علماء کو اس معاملے کی تحقیق کے لیے روانہ فرمایا کہ وہ گھوم پھر کر اصل بات معلوم کریں۔ ان علماء نے تحقیق کے بعد جو رپورٹ پیش کی وہ بڑی لرزہ خیز تھی۔ آج پونے دو سو سال بعد بھی آدمی حیرت کے جھٹکے کھانے لگتا ہے۔ ذرا جگر تھام کے سنیے کہ ایک دم اتنے غداروں کی کھیپ کیسے پیدا ہوگئی۔ انھیں غدار بنانے والے اصل غدار کون تھے...

بات یہ تھی کہ سید احمد شہید رحمہ اللہ اور شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ پکے مسلمان اور خالص توحید کے علمبردار تھے، وہ شرک و بدعت اور رسم و رواج کے خلاف تھے، مزاروں پر ہونے والی گمراہیوں سے منع کرتے تھے، ہندوستان کے بدعتی علماء نے ان حضرات کو خالص اسلام پھیلاتے دیکھا تو انھیں اپنی دُکانیں خطرے میں نظر آئیں۔ چنانچہ انھیں ''وہابی'' مشہور کر کے بدنام کرنے کی کوشش کی۔ پھر کچھ عرصے بعد انھیں پتا لگا کہ سید صاحب اپنے مجاہدین کے ساتھ سرحد و کشمیر میں اسلامی خلافت قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو یہ بدعتی علماء بڑے پریشان ہوئے۔ انھوں نے فوراً ان حضرات کے خلاف فتوے لکھے جن میں انھیں گستاخِ رسول، اولیاء کے منکر اور وہابی قرار دے کر سرحد کے مسلمانوں کو ان کے خلاف ابھارا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ انھیں اپنے علاقوں سے مار بھگائیں۔ ان فتووں میں لکھا گیا تھا:

''قبائلی سرداروں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ سید احمد نامی ایک شخص تمہارے ملک میں آیا ہے، وہ بظاہر جہاد کا دعویٰ کرتا ہے مگر یہ اس کا فریب ہے، وہ ہمارے اور تمہارے دین کا مخالف ہے، اس نے نیا دین و مذہب نکالا ہے، کسی ولی اور بزرگ کو نہیں مانتا، سب کو برا کہتا ہے، وہ انگریزوں کا ایجنٹ ہے، تم اس کے دام میں نہ آنا، اس کو تباہ کر دو اور اپنے ملک میں جگہ نہ دو، ورنہ تمہیں پچھتانا پڑے گا۔''

فتوے کے نیچے ہندوستان کے بدعتی علماء اور پیروں کی مہریں اور دستخط تھے۔ یہ فتوے خفیہ طور پر سرحد کے قبائلی سرداروں میں پھیلائے گئے، بہت سے سردار پہلے ہی شریعت کی پابندیوں کو ناگوار محسوس کر رہے تھے، یہ فتوے پڑھ کر وہ اور بھپر گئے، سید صاحب اور مجاہدین کے مخالف بن گئے اور یوں غداری کر کے انھوں نے تحریکِ جہاد کا خون کر دیا۔

سید احمد شہید بدعتی علماء کی اس سازش پر دل تھام کر رہ گئے، اب ان کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، آخر کار وہ کشمیر کی طرف روانہ ہوئے جہاں بالاکوٹ کے مقام پر سکھوں سے ان کا تصادم ہوا۔ اس لڑائی میں سید احمد صاحب اور مولانا شاہ اسماعیل اپنے سینکڑوں مجاہدین سمیت شہید ہو گئے۔ یوں تاریخ ہندوستان کا ایک روشن باب بند ہو گیا۔

آستین کا سانپ

گزشتہ دوصدیوں کے دوران انگریزوں نے مسلمانوں میں جتنے غداروں کی پرورش کی ہے، ان میں مرزا غلام احمد قادیانی کا نام سب سے نمایاں ہے۔ وہ نبوت کے جھوٹے دعوے کی وجہ سے کافر مرتد تھا اور اُمت کے لیے خطرناک گمراہ کنندہ اور بدترین دجال تھا... اس لحاظ سے اس کا یا اس کے پیروکاروں کا مسلمانوں سے کوئی تعلق ہے ہی نہیں۔

ہر مسلمان یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ مرزا قادیانی اور اس کے چیلے پکے کافر اور اسلام سے خارج ہیں، تاہم اس مضمون میں انہیں آستین کے سانپوں یعنی غداروں میں اس لیے شمار کیا جارہا ہے کہ یہ لوگ خود کو مسلمان ظاہر کر کے مسلمانوں کو دھوکا دے رہے ہیں اور مسلم معاشرے میں رہ کر ان کی بڑی بڑی حکومتوں، اداروں اور تحریکوں کی جڑیں کاٹ رہے ہیں۔

قادیانی جماعت کا بانی مرزا غلام احمد قادیانی عرف گاما قادیانی مشرقی پنجاب کے ایک گاؤں قادیان میں پیدا ہوا۔ جاگیرداروں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے آباء واجداد انگریزوں کے وفادار تھے۔ اس کا باپ مرزا غلام مرتضٰی انگریزوں کا پٹھو تھا۔

1857ء کی جنگ آزادی برپا ہوئی تو اس کے باپ اور بڑے بھائی مرزا غلام قادر نے انگریز کی دل وجان سے خدمت کی اور انگریزی فوج کا ساتھ دے کر مسلمانوں کا خون

بہایا۔

جنگ آزادی 1857ء اور اس سے کچھ عرصہ قبل سید احمد شہید رحمہ اللہ تعالیٰ کی تحریک جہاد سے انگریز یہ اندازہ لگا چکے تھے کہ جب تک مسلمانوں میں جذبہ جہاد زندہ ہے، انہیں مٹانا ناممکن ہے، چنانچہ انہوں نے مسلمانوں سے جذبہ جہاد کو بالکل ختم کرنے کے لیے ایک ایجنٹ کی تلاش شروع کر دی۔

انہی دنوں کی بات ہے کہ عرب سے ایک مجاہد رہنما شیخ صالح ہندوستان آئے۔ وہ یہاں کے محکوم مسلمانوں میں جذبہ جہاد اُجاگر کرنا چاہتے تھے۔ ان کے پاس مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کے علماء کرام کا یہ فتویٰ موجود تھا کہ ہندوستان دارالحرب ہے۔ اس فتوے کے ذریعہ وہ مسلمانوں کو جھنجھوڑنا چاہتے تھے، مگر ہوا یوں کہ جوں ہی شیخ صالح ہندوستان پہنچے، انگریزوں کو مخبروں نے ان کی خبر دے دی، چنانچہ انہیں گرفتار کر لیا گیا اور ان سے تحقیق و تفتیش شروع کی گئی۔ انگریز افسران یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ شیخ صالح کے رابطے کن کن مقامی لوگوں سے ہیں تاکہ ان سب کو بھی گرفتار کر لیا جائے۔ یہ کیس سیالکوٹ کے ڈپٹی کمشنر پارکنسن کے پاس تھا۔ شیخ صالح سے تفتیش کے دوران اسے ایک عربی جاننے والے ترجمان کی ضرورت پڑی۔ کسی نے اسے مرزا قادیانی کا نام بتایا، جو اُن دنوں بالکل غیر معروف تھا۔ پارکنسن نے مرزا کو شیخ صالح سے تفتیش میں ترجمان کے طور پر مقرر کر دیا۔ مرزا نے تفتیش میں زبردست کردار ادا کیا، اس سے انگریز افسران بہت خوش ہوئے اور مرزا گاماان کی نظروں میں اہمیت اختیار کر گیا۔

کچھ عرصہ بعد مرزا نے برطانوی انٹیلی جنس کے ایک افسر مسٹر ہنلر سے مراسم بڑھانے شروع کیے۔ یہ افسر پادری کے روپ میں ہندوستان آیا تھا۔ مرزا نے اسے یقین دلایا کہ ...

برطانوی گورنمنٹ کے لیے ہر خدمت انجام دے سکتا ہے، چنانچہ اس افسر کی وساطت سے مرزا کو انگریز حکومت نے اپنے مہرے کے طور پر منتخب کر لیا۔

انگریز حکومت کی سرپرستی ملنے کے بعد مرزا اپنے علاقے قادیان چلا گیا اور اخبارات میں مضامین لکھ لکھ کر شہرت حاصل کی۔ یہ اس کی مہم کا پہلا حصہ تھا۔ ساتھ ساتھ اس نے ہندوؤں اور عیسائیوں سے مناظرے کر کے خود کو مبلغ اسلام کے روپ میں پیش کیا۔ جب خاصے لوگ اس کے معتقد ہو گئے تو اس نے اپنی تحریروں میں جہاد کی مخالفت شروع کر دی، اس سلسلے میں اتنی کتابیں، رسالے اور مضامین لکھے کہ خود مرزا کے بقول ان سے پچاس الماریاں بھر سکتی ہیں (لیکن ہمارا دعویٰ ہے کہ ایک الماری بھی یہ لوگ بھر کر نہیں دکھا سکتے)

مرزا کی جہاد مخالف تحریک چلانے سے انگریز بڑے خوش ہوئے، وہ اس کی تحریکوں کی بڑے پیمانے پر اشاعت کے لیے خفیہ طور پر مالی تعاون کر رہے تھے۔ اِدھر مرزا نے مذہبی مبلغ اور مصلح کا روپ دھارنے کے بعد خود کو ''مجدد'' مشہور کر دیا اور پھر 1891ء میں خود کو ''مہدی'' کے طور پر متعارف کرایا... جہاد کی مخالفت ساتھ ساتھ جاری رہی۔ ہندوستان کے علاوہ عرب ممالک میں بھی وہ جہاد کی فضا ختم کرنے کے لیے کوشش کرتا رہا۔ اس نے لکھا ہے:

''میں نے بائیس برس سے اپنے ذمے یہ فرض کر رکھا ہے کہ ایسی کتابیں جن میں جہاد کی مخالفت ہو، مسلم ممالک میں ضرور بھیج دیا کرتا ہوں، اس وجہ سے میری عربی کتابیں عرب ممالک میں بھی بہت شہرت پا گئی ہیں۔ جو لوگ درندہ طبع ہیں اور جہاد کے بارے میں میری تحریریں پڑھتے ہیں وہ فی الفور چڑ جاتے ہیں اور میرے دشمن ہو جاتے ہیں۔''

اس تحریر میں درندہ طبع سے مراد مجاہدین ہیں۔ (نعوذ باللہ)

اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اُٹھا لیے گئے ہیں، مگر مرزا نے کچھ عرصے بعد دعویٰ کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں اور ساتھ ہی نبوت کا دعویٰ کرتے ہوئے خود کو مسیح موعود قرار دیا۔ مرزا قادیانی کی اس جھوٹی نبوت کو انگریز حکومت نے خوب پروان چڑھایا اور سینکڑوں لوگ گمراہ ہو کر ختم نبوت کے منکر اور انگریزوں کے ایجنٹ بن گئے۔

1908ء میں مرزا قادیانی ہیضے کے مرض میں مبتلا ہوا اور غلاظت میں لتھڑ کر بہت بری موت مر گیا۔

اس کی ساری زندگی انگریزوں کی خدمت اور مسلمانوں کی جڑیں کاٹنے میں گزری، اس کی عمر بھر کی کارستانیاں اسلام کے خلاف استعمال ہوئیں۔ مرزا نے کوئی ایک تحریر بھی ایسی نہیں لکھی جس میں مسلمانوں کی آزادی، خودمختاری، خودداری اور غیرت قومی کا احساس اُجاگر ہوتا ہو۔ اس نے پوری کوشش کی کہ مسلمان قرآن وسنت سے دور ہو کر اس کی جھوٹی نبوت کے جال میں آجائیں اور یوں انگریز کے غلام بن جائیں... مگر علماء اُمت نے اس کی ناپاک سازش کو ناکام بنانے کے لیے سرتوڑ کوشش کی۔

مولانا سید انور شاہ کاشمیری، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، پیر مہر علی شاہ گولڑوی، مولانا لال حسین اختر، مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی رحمہم اللہ جیسے بزرگوں نے تحریک ختم نبوت چلا کر قادیانیوں کے چھکے چھڑا دیے۔

قیام پاکستان کے بعد قادیانیوں نے اپنا مرکز قادیان سے چناب نگر (ربوہ) منتقل کرلیا اور سازشوں میں مصروف رہے۔ آخر کار 1953ء میں دوبارہ ان کے خلاف زبردست تحریک چلی، مختلف مراحل کے بعد ستمبر 1974ء میں پاکستان کی قومی اسمبلی نے

قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا۔ 1984ء میں صدر ضیاء الحق کی طرف سے امتناعِ قادیانیت آرڈی ننس جاری ہونے کے بعد قادیانیوں کا سربراہ مرزا طاہر لندن بھاگ گیا اور وہیں مرا۔

قادیانی اگرچہ اپنی کوششوں کے ذریعہ سادہ لوح مسلمانوں کو بہکانے میں اب بھی مصروف ہیں مگر اتنی بات یقینی ہے کہ غدارِ امت مرزا گامے قادیانی کی جھوٹی نبوت کو نہ قبولیت عامہ حاصل ہوئی تھی نہ ہو سکتی ہے۔ ان شاء اللہ وہ دن دور نہیں جب قادیانیوں کو کہیں جائے پناہ نہیں ملے گی۔

ظفر اللہ قادیانی

ملت کے غداروں کا تذکرہ ظفر اللہ قادیانی کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ یہ مرزا غلام احمد قادیانی کی جھوٹی نبوت کا پرچار کرنے والا نہایت پرجوش مبلغ تھا۔ اس نے قادیانیت کی اشاعت میں پوری زندگی گزار دی۔ اسلام کی اصل شناخت کو مٹا کر دُنیا میں قادیانیت کو پھیلانا اس کا مقصدِ حیات تھا۔ یہ 1893ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوا، انگریزی تعلیم حاصل کر کے ملکی سیاست میں شامل ہو گیا اور قادیانیت کے لیے کام کرنے لگا۔ اس وقت تک فتنہ قادیانیت سے زیادہ تر لوگ لاعلم تھے۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزوں کی سرپرستی کے ساتھ یہ ملکی سیاست میں اونچے مقام پر آ گیا۔ مسلم لیگ میں شامل ہو کر 1931ء میں اس کا صدر بن گیا۔ عام لوگوں کو معلوم ہی نہیں تھا، کتنا بڑا غدار اُن کا لیڈر بنا ہوا ہے۔ اس نے مسلم ممالک کے خلاف سازشوں میں انگریزوں اور مغربی طاقتوں کا بھرپور ساتھ دیا اور ان کا نہایت کارآمد ایجنٹ ثابت ہوا۔ اس کے اثر و رسوخ کا یہ عالم تھا کہ برطانیہ اور امریکا کے حکمران طبقے میں اس کی بات برصغیر کے بڑے بڑے سیاسی رہنماؤں سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتی تھی۔ اس کی ''خدمات'' کے اعتراف میں انگریز حکومت نے اسے ''سر'' کا خطاب دیا تھا۔

ظفر اللہ قادیانی نے 1942ء میں فلسطین کا دورہ بھی کیا تھا، جہاں برطانیہ کی سازش

سے یہودیوں کو بسا کر اسرائیل کے قیام کی کوششیں جاری تھیں۔ یہ وہ موقع تھا کہ قادیانیوں اور یہودیوں میں باقاعدہ رابطے پیدا ہوئے اور دونوں نے ایک دوسرے کے مقاصد میں ساتھ دینے کی پالیسی بنائی۔ آج بھی اسرائیلی فوج میں ایک حصہ صرف قادیانیوں پر مشتمل ہے۔

1946ء میں جب اسرائیل کے قیام کی کوششیں کامیابی کے قریب پہنچ گئیں تو ظفر اللہ قادیانی نے امریکا پہنچ کر برطانوی، امریکی اور صہیونی لیڈروں سے خفیہ مذاکرات کیے، قادیانیت کے پرچار کے لیے ان سے باقاعدہ تعاون کے معاہدے طے کیے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برطانیہ، امریکا اور مغربی ممالک میں قادیانیوں کے تبلیغی مراکز قائم ہو گئے اور وہاں کے مسلمانوں میں زور شور سے قادیانیت کی تبلیغ ہونے لگی۔ اِدھر فلسطین کا مسئلہ بھی قادیانیوں کی حمایت کے ساتھ یہودیوں کے حق میں چلا گیا اور اسرائیل کا قیام طے ہو گیا۔

اِدھر تحریک پاکستان اپنے آخری مراحل میں تھی۔ ظفر اللہ قادیانی کو انگریزوں نے مسلمانوں کے سیاسی رہنما کے طور پر پہلے ہی مشہور کر دیا تھا، چنانچہ ایک سازش کے تحت اسے قیام پاکستان کے ساتھ ہی پاکستان کا وزیر خارجہ بنوا دیا گیا، ظفر اللہ قادیانی نے اس اہم منصب پر فائز ہو کر نہ صرف پاکستان کی جڑیں کاٹیں بلکہ 1948ء میں اسرائیل کے قیام کے لیے بھی زبردست کام کیا۔ اس نے حکومت پاکستان کی پالیسی کے برخلاف فلسطینیوں کی جدوجہد آزادی کو ناکام بنانے کے لیے ناپاک سرگرمیاں جاری رکھیں... 11 ستمبر 1948ء کو بانئ پاکستان محمد علی جناح کا انتقال ہوا تو ظفر اللہ قادیانی نے موقع پر موجود ہوتے ہوئے بھی ان کے جنازے میں شرکت نہیں کی، کیونکہ محمد علی جناح قادیانی کی جھوٹی نبوت کو نہیں مانتے تھے۔ ظفر اللہ جنازے کے موقع پر غیر مسلم سفیروں کے ساتھ کھڑا رہا۔

مسلم لیگ کے کئی عہدے داروں مثلاً عبدالرب نشتر وغیرہ کو اس کی خباثت کا اندازہ ہو گیا تھا مگر اس کی سازشوں کی روک تھام نہ کر سکے۔

اس بد بخت نے کراچی کے آرام باغ میں قادیانیوں کا بہت بڑا جلسہ منعقد کیا اور اس میں اسلام کے خلاف کھل کر بے ہودہ گوئی کی اور یہاں تک کہا:

''اسلام ایک مردہ مذہب ہے اور احمدیت (قادیانیت) زندہ مذہب ہے۔''

ظفر اللہ کے یہ غلیظ جملے سن کر کراچی کے مسلمان جلسہ گاہ پر پل پڑے اور سارا جلسہ درہم برہم کر دیا۔ شہر کے حالات کشیدہ ہو گئے۔ پورے ملک میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔

عوامی جذبات کا ردعمل 1953ء کی تحریک ختم نبوت کی صورت میں نکلا۔ اس میں ظفر اللہ جیسے ظالم حکومتی عہدے داروں کی شہ پر دس ہزار مسلمانوں کو شہید کیا گیا... مگر تحریک نہ دب سکی۔ آخر ظفر اللہ قادیانی دو سال بعد وزارت خارجہ چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ اب وہ اپنے کافر آقاؤں کی گود میں جا بیٹھا اور 1973ء تک عالمی عدالت انصاف (درحقیقت مسلمانوں کے لیے عالمی بے انصافی کی کچہری) کا رکن بن گیا۔ 1985ء میں وہ مرکز ''ربوہ'' میں دفن ہوا، جہاں اس کی قبر جہنم کے گڑھے کے طور پر نظارہ عبرت بنی ہوئی ہے۔

عبدالسلام قادیانی

ڈاکٹر عبدالسلام قادیانی ملک کے غداروں میں سے وہ بدبخت انسان ہے جس نے عالم اسلام خصوصاً پاکستان کو اپنی مکروہ سازشوں کے ذریعے بہت نقصان پہنچایا۔

اس کا تعلق قادیانی ٹولے سے تھا۔ وہ ایک کٹر قادیانی تھا، جو سائنس کی آڑ میں قادیانیت کا زہر پھیلانے میں مصروف رہا۔ اس نے سائنس وٹیکنالوجی میں مہارت ضرور حاصل کی، مگر اس فن اور مہارت کو اسلام اور پاکستان کے خلاف استعمال کرتا رہا۔

بہت سے لوگ ڈاکٹر عبدالسلام کو اس لیے بڑا آدمی سمجھتے ہیں کہ اسے ''نوبل پرائز'' دیا گیا تھا۔ نوبل پرائز ایک انعام ہے، جو برنارڈ نوبل نامی ایک مالدار یورپی سائنسدان کی جائیداد سے ہر سال دیا جاتا ہے۔

کہا جاتا کہ دُنیا کی مختلف شخصیات کو ''اہم کارنامے'' انجام دینے پر یہ انعام دیا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ انعام مغربی ممالک اپنے سیاسی اور نظریاتی مفادات کو سامنے رکھ کر دیتے ہیں۔ مثلاً 1978ء میں ''امن کا نوبل انعام'' اسرائیل کے وزیر اعظم مسٹر بیگن کو دیا گیا جو ہزاروں فلسطینیوں کا قاتل اور بڑا خون آشام انسان تھا۔ جب کہ امن کے لیے بڑے بڑے کارنامے انجام دینے والے مسلمان لیڈروں اور دانشوروں کو آج تک یہ انعام نہیں ملا، اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ آج تک کسی مسلمان سائنسدان کو نوبل انعام نہیں دیا

گیا۔ ہاں عبدالسلام قادیانی کو کفر کی سازشوں میں شرکت کی وجہ سے یہ انعام دے کر دُنیا کا بڑا ''مسلم سائنسدان'' مشہور کر دیا گیا۔ اس طرح گویا قادیانیوں کو مسلمان ظاہر کرنے کی کوشش بھی گئی۔ یہ سازش کامیاب رہی۔ آج بھی بہت سے ناسمجھ پاکستانی عبدالسلام قادیانی کو مسلمان سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ دُنیا کا پہلا مسلم سائنسدان ہے جسے نوبل انعام ملا، حالانکہ یہ بہت بڑا دھوکا ہے، عبدالسلام نہ مسلمان تھا اور نہ ہی اتنا قابل تھا۔ اگر واقعی پاکستان کے کسی سائنسدان کو قابلیت کی بناء پر نوبل انعام دیا جاتا تو ڈاکٹر عبدالقدیر خان اس کے سب سے زیادہ حق دار تھے، مگر ان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا، وہ آپ سب جانتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام کی نوبل انعام کے لیے نامزدگی کے بارے میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا:

''ڈاکٹر عبدالسلام 1957ء سے اس کوشش میں تھے کہ انہیں نوبل انعام ملے۔ آخر کار آئن سٹائن (ایک یہودی سائنسدان) کے صد سالہ یوم وفات پر ان کا مطلوبہ انعام دے دیا گیا۔ دراصل اسرائیل میں قادینیوں کا ایک باقاعدہ مشن ہے جو ایک عرصہ سے کام کر رہا ہے۔ یہودی چاہتے تھے کہ آئن اسٹائن کی برسی پر اپنے ہم خیال لوگوں کو خوش کر دیا جائے، چنانچہ ڈاکٹر عبدالسلام کو بھی انعام سے نوازا گیا'' (چٹان، لاہور، 6 فروری 1976ء)

ڈاکٹر عبدالسلام کی وطن دشمنی کا ثبوت یہ ہے کہ جب 1974ء میں پاکستان کی قومی اسمبلی نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا تو ڈاکٹر عبدالسلام بھی اپنا حکومتی عہدہ چھوڑ کر احتجاج کرتے ہوئے لندن چلا گیا۔ بعد میں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اسے پاکستان بلوانے کی کوشش کی تو اس غدار نے جواب دیا:

''میں اس لعنتی ملک میں قدم نہیں رکھنا چاہتا۔''

ڈاکٹر عبدالسلام پاکستان کے ایٹمی پروگرام کا سخت مخالف تھا اور اس بارے میں بڑے پیمانے پر سازشیں کرتا رہا۔ اس نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو اس منصوبے سے ہٹانے کے لیے بڑی کوششیں کیں۔ پورے ملک کے قادیانی افسران اس کے لیے سرگرم رہے، اگر مسٹر بھٹو اور صدر ضیاء الحق نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو خود مختار نہ بنایا ہوتا تو کہوٹہ ایٹمی پلانٹ کب کا درہم برہم ہو گیا ہوتا اور پاکستان کبھی ایٹمی طاقت نہ بن پاتا۔

پاکستان کے خلاف سازشوں کے لیے ڈاکٹر عبدالسلام بھارت کے دورے بھی کرتا رہا۔ 1989ء میں اس نے بھارت کے اگنی میزائل کے کامیاب تجربے پر خود بھارت جا کر وزیر اعظم راجیو گاندھی کو مبارکباد دی۔ سب جانتے ہیں کہ اگنی میزائل پاکستان کے خلاف ہی تیار کیا گیا ہے۔ اس کی تیاری پر ڈاکٹر عبدالسلام قادیانی کا ہندوؤں کو مبارکباد دینا پاکستان دشمنی کا ثبوت نہیں تو اور کیا ہے؟

ڈاکٹر عبدالسلام قادیانی نے پاکستان سے نفرت کی وجہ سے دوبارہ یہاں رہائش اختیار نہیں کی، تاہم اس ملک میں قادیانی مقاصد کی تکمیل کے لیے وہ پاکستان کے دورے ضرور کرتا رہا۔ اپنے ہر دورے میں وہ کوئی نئی سازش اور نیا جال لے کر آتا اور کھل کر اسلام، مسلمانوں اور اسلامی تہذیب سے نفرت کا اظہار کرتا۔ ایک دورے میں پریس کانفرنس کے دوران اس نے عربی زبان کے خلاف ہرزہ سرائی کی اور اسے ایک غیر مانوس اصطلاعات والی زبان قرار دیا۔

پاکستان کے حکمرانوں نے ڈاکٹر عبدالسلام قادیانی کے اسلام دشمن ہونے کے باوجود اسے اعزاز و اکرام سے نواز کر بڑی حماقت کا ثبوت دیا۔ 1986ء میں اسے پاکستان کا اعلیٰ

سول ایوارڈ نشانِ امتیاز سے نوازا گیا، جس سے مسلمانوں کی سخت دل شکنی ہوئی۔ 1988ء میں اسے پنجاب کی تعلیمی پالیسی کا نگران بنا دیا گیا۔ اس مقصد کے لیے ڈاکٹر عبدالسلام کو بار بار پاکستان کے دوروں پر بلوایا جاتا رہا۔ اس سارے اسلام دشمن کھیل کے پیچھے وہ بڑے بڑے قادیانی افسران کام کر رہے تھے جو پاکستان کے اہم اداروں میں حاوی تھے، انہی کی کوششوں سے 1986ء میں پاکستان میں سرکاری و نیم سرکاری سطح پر ڈاکٹر عبدالسلام کو سترویں سالگرہ منانے اور اسے ''زندہ ہیرو'' قرار دیا گیا، جبکہ پوری قوم اس غدارِ پاکستان سے نفرت کا اظہار کر رہی تھی، مگر اس وقت جب کہ یہ سالگرہ منائی جارہی تھی برطانیہ میں رہائش پذیر عبدالسلام قادیانی کو گردوپیش کا کوئی ہوش نہیں رہا تھا، اس آستین کے سانپ کو اسلام دشمنی ملک سے غداری مرزا قادیانی کی غلامی اور ختم نبوت کی توہین کی سزا دُنیا میں ہی شروع ہوگئی۔ اس کی یادداشت ختم ہوتی جارہی تھی۔ وہ ایک پُراسرار بیماری کا شکار ہو گیا تھا، اس بیماری کا مریض سب کچھ بھول جاتا ہے، تکلیف سے تڑپتا رہتا ہے اور چلنے پھرنے سے معذور ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ بول چال کے قابل بھی نہیں رہتا۔ عبدالسلام قادیانی کا بھی یہ حال ہو رہا تھا... وہ تڑپ رہا تھا، پاگلوں جیسی حرکات کر رہا تھا... یہودیوں کو اور قادیانیوں کو جس سائنسدان کی ذہانت پر ناز تھا اس کی ذہن کی پلیٹ سے سب کچھ صاف ہو چکا تھا۔ نوبل انعام حاصل کر کے دُنیائے کفر سے داد وصول کرنے والا سائنسدان دُنیا بھر کے چوٹی کے ڈاکٹروں کے نزدیک لاعلاج ہو چکا تھا... علاج کیسے ممکن ہوتا۔ یہ تو خدا کا قہر تھا، جو اس بدذات پر نازل ہو رہا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے نہ صرف بیماری کی شکل میں اس پر عذاب نازل کیا بلکہ دُنیا کو ایک عبرت ناک نظارہ بھی دکھا دیا۔ ڈاکٹر عبدالسلام کو آخری دنوں میں قادیانی جماعت کی توجہ اور مدد کی

شدید ضرورت تھی مگر اس موقع پر قادیانی جماعت کے بڑوں نے اس سے آنکھیں پھیر لیں، انہیں اب بے دست بوڑھے پاگل ڈاکٹر کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ قادنیوں کے سربراہ مرزا طاہر پہلے ہی ایک مسئلے پر اختلاف کی باعث اس سے ناراض تھا، چنانچہ مرزائیوں نے اپنے ہیرو کو بالکل تنہا چھوڑ دیا۔

دسمبر 1996ء کے ایک سرد دن لاچار عبدالسلام قادیانی کی روح جسم کا ساتھ چھوڑ گئی... قادیانی سربراہ مرزا طاہر نے اس کے مرنے پر دعا تک نہیں کی، نہ اپنی کسی تقریر میں اس پر اظہارِ افسوس کیا۔ پاکستان میں قادیانی مرکز چناب نگر (ربوہ) میں بھی عبدالسلام قادیانی کی موت پر سوگ یا تعزیت جیسی کوئی ہل چل دیکھنے میں نہیں آئی۔

یوں عبدالسلام قادیانی دُنیا و آخرت دونوں میں بے عزتی، رسوائی اور ناکامی کی سیاہی منہ پر مل کر برطانیہ کے ایک قبرستان میں نشانِ عبرت بن گیا۔

......☆......

ترکی کا مردِ غدّار

اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غالب اور مسلمانوں کو متحد اور یکجا رکھنے کے لیے ہمیں ''خلافت'' کی نعمت عطا کی۔ خلیفہ اللہ کا نائب ہوتا ہے جو قرآن و سنت کے مطابق مسلمانوں کا سیاسی نظام چلاتا ہے۔ خلافت کا سب سے پہلا دور خلافت راشدہ کا تھا جس میں افضل ترین صحابۂ کرام نے مسلمانوں پر حکومت کی اور اسلام کو ہر طرف پھیلا دیا۔ دوسرا دور خلفائے بنو امیہ کا تھا، جو تقریباً نوے سال تک رہا، اس میں بھی مسلمانوں کو خوب فتوحات ہوئیں، محمد بن قاسم، طارق بن زیاد اور قتیبہ بن مسلم جیسے مجاہدوں نے یورپ، چین اور ہندوستان تک اسلام کے جھنڈے گاڑ دیے۔ تیسرا دور عباسی خلفاء کا تھا، ان کا مرکز بغداد تھا۔ عباسی خلفاء نے تقریباً سوا پانچ سو سال تک بڑی آن بان سے حکومت کی اور بڑے بڑے کارنامے انجام دیے، مسلمان علوم و فنون کی معراج کو پہنچے۔ عباسیوں کے آخری دور میں مسلمانوں کا سیاسی زوال شروع ہو گیا اور آخر کار تاتاریوں نے اسلامی خلافت کو ختم کر دیا۔

مگر مسلمان خلافت کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے، چنانچہ جلد ہی ترکی میں عثمانی خلافت قائم ہو گئی۔ اس خاندان کے خلفاء نے تقریباً ساڑھے چھ سو سال تک حکومت کی اور یورپ کے قلب تک مسلمانوں کی حکومت قائم کر دی۔ عثمانی خلفاء ایک ہی وقت فلسطین، شام، ترکی، عراق اور عرب کے حکمران تھے۔

صدیوں سے کفار اسلامی خلافت کو جڑ سے ختم کر دینے کی کوشش کر رہے تھے مگر مسلمان کبھی بھی اتنے غافل نہ رہے کہ ان کی سازش کامیاب ہو جاتی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جب مسلمان شدید افتراق و انتشار کا شکار تھے، کفار کو یہ موقع مل گیا اور ان کی سازش کامیاب ہوگئی۔ اس سازش کے اصل بانی یہودی تھے جب کہ ان کے آلہ کار کا نام مصطفیٰ کمال پاشا تھا۔ یہودیوں کی اس سازش کا سبب یہ ہوا تھا کہ یہودی بیت المقدس کی زمین حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے عثمانی خلیفہ کو بار بار بھاری معاوضے کے بدلے بیت المقدس کی زمین فروخت کرنے کا کہا مگر خلیفہ اپنے آباؤ اجداد کی طرح دین دار تھا، اس نے یہودیوں کو جھڑک دیا۔ تب یہودیوں نے قسم کھائی کہ وہ اسلامی خلافت کو ختم کر کے دم لیں گے۔ انھوں نے عثمانی خلافت کے خلاف ایک آفیسر مصطفیٰ کمال پاشا کو اپنے ساتھ ملا لیا۔

مصطفیٰ کمال پاشا 1881ء میں ترکی میں پیدا ہوا تھا۔ فوجی درسگاہ میں پڑھ کر حکومت کا آفیسر بن گیا تھا۔ وہ شروع سے آزاد خیال اور عثمانی خلفاء کا مخالف تھا۔ خلیفہ عبدالحمید دوم کے زمانے میں اس نے ایک خفیہ جماعت بنا کر خلیفہ کے خلاف ساز باز بھی کی تھی مگر گرفتار ہو گیا تھا۔ رہا ہو کر اس نے سوچا، اب کوئی نیا طریقہ آزمانا چاہیے، چنانچہ وہ فوج میں شامل ہو گیا، چونکہ ہوشیار اور تیز طرار تھا اس لیے کئی ''کارنامے'' انجام دے کر فوج کے بڑے افسران کی صف میں پہنچ گیا۔ اس دوران یہودیوں نے اسے عثمانی خلافت کے خلاف باقاعدہ اپنے ساتھ ملا لیا اور اپنی جماعت ''فری میسن'' کا ایجنٹ بنا لیا۔ اب ایک بہت بڑا ڈرامہ رچایا گیا۔ اس پر عمل جنگ عظیم اوّل کے دوران ہوا۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے ترکی پر حملہ کیا اور ترکی کے دارالحکومت استنبول کو گھیر لیا۔ مصطفیٰ کمال کی ڈیوٹی کہیں اور تھی مگر اس نے طے شدہ پروگرام کے مطابق استنبول آ کر انگریزوں اور فرانسیسیوں سے شہر کا دفاع

شروع کر دیا... پھر منصوبے کے مطابق انگریز اور فرانسیسی پیچھے ہٹ گئے اور ہر طرف مشہور کر دیا گیا کہ مصطفیٰ کمال کی وجہ سے استنبول بچ گیا۔

اس ''کارنامے'' پر پوری ترک قوم بلکہ پورے عالم اسلام میں مصطفیٰ کمال کو شہرت اور نیک نامی ملی۔ خلیفہ نے اس کا عہدہ بڑھا کر اسے فوج کا جنرل بنا دیا۔ مصطفیٰ کمال اس دوران اپنی ایک الگ جماعت بنا چکا تھا جو خفیہ طور پر کام کر رہی تھی۔ اب مصطفیٰ کمال کو اتنا اختیار بھی مل گیا تھا کہ وہ یہودیوں کے منصوبے کو تکمیل تک پہنچاتا۔ چنانچہ اس نے 2 جنوری 1919ء کو ایک سیاسی جماعت کے صدر کی حیثیت سے ترکی میں خلافت سے الگ ایک حکومت قائم کر لی اور دوسرے مسلم ممالک پر یہ ظاہر کیا کہ خلیفہ ملک کے انتظام کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس لیے ایسا کرنا پڑا۔

دُنیا بھر کے مسلمانوں نے اسے خاموشی سے برداشت کر لیا اور یہی سمجھتے رہے کہ مصطفیٰ کمال اپنے ملک کا ہمدرد ہے اور اس نے شدید ضرورت کے تحت ایسا کیا ہوگا۔ اب ترکی میں خلیفہ کی حکومت صرف استنبول میں رہ گئی تھی، باقی پورا ملک مصطفیٰ کمال کے ہاتھ میں تھا۔ جب مصطفیٰ کمال کی ترکی پر گرفت مضبوط ہوگئی تو چند سالوں کے بعد اس نے استنبول سے خلیفہ کی برائے نام حکومت بھی ختم کر دی۔ خلیفہ وحید الدین 4 نومبر 1922ء کو دارالخلافہ استنبول چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ یوں عملاً خلافت ختم ہوگئی۔ تاہم دُنیا کو مطمئن رکھنے کے لیے مصطفیٰ کمال پاشا نے عثمانی خاندان کے ایک شہزادے عبدالحمید کو خلیفہ بنانے کا اعلان کر دیا۔ مگر اب خلافت کا منصب بالکل برائے نام ہی رہ گیا تھا۔ جب اسلامی دُنیا اس پر بھی خاموش رہی تو 3 مارچ 1924ء کو مصطفیٰ کمال نے خلافت کو بالکل ختم کر دینے کا اعلان کر کے خلیفہ عبدالحمید کو بھی تخت سے اتار دیا... یوں اس دن مسلمان اسلامی خلافت کی

نعمت عظمیٰ سے محروم ہو گئے اور آج تک محروم ہیں۔

مصطفیٰ کمال اب آزاد تھا، اس بد بخت نے اب دل کھول کر ''اسلام'' سے بدلہ لیا، کھل کر اپنا کفر ظاہر کیا، ترکی کے آئین سے مذہب کے اسلام ہونے کا لفظ نکال دیا۔ دینی مدارس ختم کر دیے گئے۔ عورتوں کے پردے کو جرم قرار دیا گیا، لوگوں کے لیے مسلمانوں جیسی ترکی ٹوپیاں پہننا منع کر دیا گیا، اسلامی لباس ممنوع ہو گیا، ہر شخص پر لازم تھا کہ وہ انگریزی لباس پہنے، حکم تھا کہ لوگ گھر کے باہر ننگے سر پھریں یا انگریزی ہیٹ پہن کر نکلیں۔

پھر اس اسلام دشمن انسان نے ترکی کا عربی رسم الخط تبدیل کر کے رومی رسم الخط لازمی قرار دے دیا۔ اس کے باعث نئی نسل کے بچے قرآن و حدیث اور دینی کتابوں سے محروم ہو گئے۔ حد تو یہ ہے کہ اس ظالم نے نماز، تلاوت اور اذان پر بھی پابندی لگا دی، کہا کہ اگر کوئی نماز پڑھے تو ترکی زبان میں پڑھے، اذان دینا چاہے تو ترکی زبان میں دے، تلاوت بھی ترکی زبان میں کرے یعنی قرآن مجید کا صرف ترجمہ پڑھے۔ اس طرح ترکی میں بے دینی کا وہ طوفان آیا کہ ساڑھے چھ سو سال تک اسلام کا مرکز رہنے والا یہ خطہ اسلام کے نقوش تک سے محروم ہو گیا اور بالکل یورپی ملکوں کی طرح بے حیا معاشرے کا نقشہ پیش کرنے لگا۔

یہ تھا ترکی کی خلافت اسلامیہ سے یہودیوں کا بھیانک انتقام۔ جس کے لیے مصطفیٰ کمال پاشا ایجنٹ بن کر استعمال ہوا۔ ترکی جو کہ پہلے عراق، شام، فلسطین اور عرب تک پھیلا ہوا تھا، اب سمٹ کر صرف موجودہ چھوٹے سے ترکی تک محدود رہ گیا۔ باقی علاقے انگریزوں نے ترکی سے چھین کر چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تبدیل کر دیے۔

یہ تھا اصل چہرہ مصطفیٰ کمال پاشا کا مگر مغربی میڈیا نے ہمیشہ اسے اسلام کے سب سے

بڑے لیڈر کے طور پر مشہور کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی اکثر مسلمان اس کا نام بڑے ادب و احترام سے لیتے ہیں، اسے محسنِ قوم سمجھتے ہیں، حالانکہ مصطفیٰ کمال پاشا کا نام ملتِ اسلامیہ کے چند سب سے بڑے غداروں میں شمار کرنے کے قابل ہے۔ یہ آستین کا سانپ 10 نومبر 1938ء کو مرا۔ اس کے چیلے چانٹے اس کے بعد بھی ترکی سے اسلام کو مٹانے کا کام کرتے رہے۔ پھر یہودیوں نے بھی بہت جلد برطانیہ اور امریکا کی مدد سے فلسطین پر قبضہ کرلیا اور بیت المقدس بھی مسلمانوں سے چھین لیا۔ ترکی آج تک اپنا کھویا ہوا اسلامی وقار حاصل نہیں کرسکا۔ مصطفیٰ کمال کی پھیلائی ہوئی بے دینی کے اثرات آج تک وہاں عام نظر آتے ہیں۔

جنرل یحییٰ اور جنرل نیازی

قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک ہمارا ملک جتنے بڑے سانحوں سے گزرا ہے، ان میں 1971ء کا سانحہ مشرقی پاکستان سب سے ہولناک اور خون ریز تھا۔مشرقی پاکستان پاکستان سے الگ ہوکر بنگلہ دیش بنا تو نہ صرف اہل پاکستان بلکہ دُنیا بھر کے مسلمانوں پر قیامت بیت گئی۔ بھارت، امریکا اور اسرائیل کی ناپاک سازش کامیاب ہوگئی اور مسلمانوں کو تاریخ کی بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا...مگر یہ بھی ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ اس شکست میں غیروں سے زیادہ اپنوں کا ہاتھ تھا...ان غداروں کا جو آستین کے سانپ بنے، پاکستان کو ڈس رہے تھے۔

سانحہ مشرقی پاکستان کی کہانی میں دو کردار سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔

(1) شیخ مجیب الرحمٰن 1971ء کے عام انتخابات میں شیخ مجیب نے مشرقی پاکستان سے سب سے زیادہ ووٹ حاصل کیے۔

(2) ذوالفقار علی بھٹو: عام انتخابات میں ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی نے مغربی پاکستان میں اکثریت حاصل کی۔

اس کے بعد دونوں لیڈروں نے وزارت عظمیٰ حاصل کرنے اور ریاست بنانے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں اختلاف یہاں تک جا پہنچا کہ شیخ مجیب نے مشرقی پاکستان

کو الگ کرنے کی دھمکی دے دی...

اس وقت پاکستان کا حکمران صدر جنرل یحییٰ خان تھا۔اس کی ذمے داری تھی کہ ان دو بڑے سیاست دانوں میں تصفیہ کراتا، دوراندیشی اور سنجیدگی سے کام لیتا، مگر یحییٰ خان تو آستین کا وہ سانپ تھا جو پاکستان کو تباہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔اس نے اس سیاسی بحران کی آگ میں مزید ایندھن ڈالا اور جان بوجھ کر ایسے فیصلے کیے جس سے مشرقی پاکستان کے مسلمانوں میں مغربی پاکستان کے مسلمانوں سے نفرت بڑھتی چلی گئی۔

یحییٰ خان ایک سازشی بدکردار اور عیش پرست انسان تھا، شراب و کباب اور ناچ رنگ میں مشغول رہتا تھا۔اس نے سازشوں کے ذریعے صدر ایوب خان کو اقتدار سے محروم کیا اور خود پاکستان کا سربراہ بن گیا۔ جب عالمی طاقتوں نے دیکھا کہ پاکستان کی حکومت ایک عیاش اور بدکردار آدمی کے پاس آگئی ہے تو انھوں نے یحییٰ خان کو اپنے مطلب کا آدمی سمجھا اور اس کی حکومت کے دوران مشرقی پاکستان میں زبان اور نسل کی بنیاد پر علیحدگی کے جذبات کو بھڑکایا۔ یحییٰ خان یہ سب کچھ خاموشی سے دیکھتا رہا، اس نے قوم کے خیرخواہوں کے مشوروں کو بالکل نظر انداز کر دیا اور نفرت کی اس آگ کو پھیلنے دیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ آخر 1971ء کے عام انتخابات کے بعد مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی تحریک چل پڑی۔ وہاں مسلمان مسلمان کو قتل کر رہا تھا اور اسلام آباد میں حکمرانِ پاکستان شراب کی محفل سجائے بیٹھا تھا۔نوبت یہاں تک پہنچی کہ بھارت نے شیخ مجیب کی مدد کے نام پر اپنی فوج مشرقی پاکستان میں داخل کر دی۔جس وقت ایک فوجی افسر یہ خبر لے کر صدر یحییٰ کے محل پہنچا تو اسے دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ کیوں کہ صدر یحییٰ خان اپنے دوستوں کے ساتھ فحش فلمیں دیکھنے میں مشغول تھا۔ یحییٰ خان کے اردگرد ہر وقت قسم قسم کی آوارہ عورتوں کا ہجوم رہتا تھا۔ان میں سے بعض عورتیں بھارت

کی جاسوس تھیں جو ایوانِ صدر کے قیمتی راز بھارت کو پہنچا رہی تھیں۔

یحییٰ خان جیسا غدار خود تھا، ایسے ہی کئی لوگ اس نے اپنے پاس جمع کر رکھے تھے۔ ان میں ایک مشہور نام جنرل نیازی کا ہے۔ جب مشرقی پاکستان میں فوج بھیجنے کا فیصلہ ہوا تو یحییٰ خان نے جنرل نیازی کو اس مہم کے لیے مقرر کیا۔ کئی اعلیٰ فوجی افسران نے اس فیصلے کی مخالفت کی مگر یحییٰ خان کے سامنے کون دم مار سکتا تھا۔

جنرل نیازی فوج کا کمانڈر بن کر مشرقی پاکستان روانہ ہوا۔ قوم کے خیر خواہوں نے اس وقت سمجھ لیا تھا کہ اب مشرقی پاکستان میں شکست ہو کر رہے گی۔ جنرل نیازی نے وہاں جا کر بھارت کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی بجائے ہتھیار ڈال دیے اور 90 ہزار افراد کو قیدی بنا کر بھارت کے سامنے پیش کر دیا۔ اس بدترین شکست پر پورے ملک میں صفِ ماتم بچھ گئی تھی۔ مگر خود جنرل نیازی کا کیا حال تھا۔ وہ ہتھیار ڈالنے کے معاہدے پر دستخط کرنے کے کچھ دیر بعد ایسا خوش نظر آتا تھا جیسے سب کچھ ٹھیک ہوا۔ بریگیڈیئر صدیق سالک شہید کے بقول اس وقت وہ بھارتی جنرل ناگرہ کو ایسے گندے لطیفے سنا رہا تھا جن کے بیان سے حیا مانع ہے۔

یہ تھے وہ غدار اور آستین کے سانپ جن کے برے کرتوتوں کے باعث پاکستان دو ٹکڑے ہوا... آستین کے سانپوں کی کہانیاں تاریخ میں آئندہ بھی لکھی جاتی رہیں گی، کیونکہ جوں جوں وقت آگے بڑھ رہا ہے، ان کہانیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جنھیں اگلے دور کا مورخ تحریر کرے گا۔ یہ بات طے ہے کہ جب تک امت ان غداروں سے نجات نہیں پاتی، اس کی کامیابی و کامرانی کا خواب ادھورا رہے گا۔

ختم شد

"تاریخِ اسلامی کے صفحات گواہ ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کو جتنا نقصان اِن آستین کے سانپوں نے پہنچایا، سامنے کے کھلے دشمن اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں پہنچا سکے۔ خود حضورا اور صحابہ کرام کے دور میں مشرکین اور کھلے کفار کی بنسبت منافقین کی ریشہ دوانیوں نے جو نقصان نوزائیدہ مسلم ریاست کو پہنچایا، وہ بیان سے باہر ہے۔

اس کتاب میں امت مسلمہ کی گود میں پلتے اُن بڑے بڑے فتنوں کی سچی کہانیاں ہیں، جن کی فتنہ گری نے چند سو یا ہزار مسلمانوں کو نہیں، بلکہ بلاشبہ لاکھوں مسلمانوں زمانوں تک متاثر کیا۔ یہ جب تک زندہ رہے، غیروں کے اشاروں پر مسلمانوں میں پھوٹ ڈالتے رہے۔ مرے تو چاہے اپنی موت مرے یا مجاہدین کے پیروں تلے کچلے گئے، عبرت کا نشان تو گرچہ بنے، مگر مرتے مرتے بھی ایسے فتنے جگا گئے کہ اُن کی زہرناکی بعد کی کئی صدیوں تک مسلمانوں میں انتشار اور باہمی فساد کا ذریعہ بنی رہی۔ بالخصوص سبائیت وخوارجیت کے فتنے تو ایسے زہریلے اور طاقتور نکلے کہ چودہ صدیاں ختم ہونے کو آئیں، اب تک جسدِ امت کی رگوں میں پوری قوت سے دوڑ رہے ہیں اور بدبودار پھوڑوں کی صورت ظاہر ہو رہے ہیں۔"

محمد فیصل شہزاد

معروف ادیب، کالم نگار